گونج

کیفؔ عرفانی

نرائن دت سہگل اینڈ سنز پبلشرز
اندرون لوہاری گیٹ لاہور

Price Rs. 1/8

کیفی عرفانی

نرائن دت سہگل اینڈ سنز پبلشرز
اندرون لوہاری گیٹ لاہور

Price Rs. 1/8/-

اِنتساب

نیتاجی کے نام

اشعارِ کامیاب بنامِ سبھاش بوس
انوارِ انقلاب بنامِ سبھاش بوس
اے کیفؔ باخلوص و نیاز و کمالِ عجز
کرتا ہوں انتساب بنامِ سبھاش بوس

فہرست

پیش لفظ

میں سیاست دان تو نہیں، لیکن سیاست سے متأثر ضرور ہوں۔ اور یہی تأثرات اس مجموعے کی تخلیق کا باعث ہوئے

ادب و سیاست دو مختلف راہیں ہیں۔ مجھے سیاسی شاعری سے ہرچند کوئی رغبت نہیں۔ پھر بھی میرا ذوقِ شعری محض ادبی شاعری تک ہی محدود نہیں حسن و عشق، گل و بلبل، شمع و پروانہ اور رقص و نغمہ بہترین موضوعِ سخن ہیں۔ لیکن موجودہ ماحول اس قدر تلخ اور ناسازگار ہے کہ میرا پورہ ذہن پر ظلمتیں ہی ظلمتیں محیط ہیں۔ ہر تجلی دنیا کے خونیں مناظر کا پرتو ہے۔ اِس عالم میں اگر کوئی بدذوق ہو۔ تو وہ سب سے زیادہ باذوق ہے۔ بھوک سے تڑپتے ہوئے جسم۔ مرجھائے ہوئے چہرے جب نظر آتے ہیں۔ تو مجھ ایسے خلوتی شوق کو بھی منظرِ عام پر آکر ان کا ہمنوا ہونا پڑتا ہے۔

ہٹلر۔ مسولینی اور ہیری ہیٹو کی لگائی ہوئی آگ کے شعلے اگرچہ

خاموش ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کے اثرات ابھی تک نرم فضاؤں میں موجود ہیں۔ فسطائیت اور نازی ازم کا بہیمانہ تصور فراموش ہو چکا ہے۔ جاپانیوں کے خوفناک ارادے امن پسندوں کے قدموں میں دم توڑ رہے ہیں۔ جاپان کی بے روح مذہب پرستی ختم ہو چکی ہے۔ "SHINTO" جاپان کی ارضِ مقدس جہاں کسی غیر انسان کا گذر بھی ناممکن تھا۔ اب گذرگاہِ عوام ہے۔ دُنیا بہت حد تک ملوکیت کے چنگل سے آزاد ہو چکی ہے۔ مگر پھر بھی افلاس، غلامی اور مظلومی ایک عالمگیر انقلاب کے منتظر ہیں۔ اور وہ انقلاب بڑی طاقتوں کے اُبھار سے نمایاں ہوگا۔ میری سیاسی شاعری اس انقلاب کی آئینہ دار ہے۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں۔ کہ یہ مجموعہ میری اخباری زندگی کا سرمایہ ہے۔ جو خالص سیاسی افراد کی نذر کرتا ہوں۔ میری ادبی شاعری جس سے مجھے خاص لگاؤ ہے۔ مستقبل قریب میں دوسرے مجموعے کی صورت میں منصۂ شہود پہ آجائے گی۔

کیف عرفانی

انیائے

آغا خان تُلے ہیروں سے
کتنا انیائے ہے جگ میں
اِک انساں بھوکا، مرجائے
اِک انسان تُلے ہیروں سے
کچھ ارمان بنے ہیں آنسو
کچھ ارمان تُلے ہیروں سے
مُفلس لوگو تم دیکھو گے
کب تک یوں اپنا اپمان
تم بھی آخر ہو اِنسان

قحطِ بنگال

تُو کلکتے سے آیا ہے
تُو نے کال بھی دیکھا ہوگا
بھوکے، ننگے انسانوں کا
آخر حال بھی دیکھا ہوگا

میں کلکتے سے آیا ہوں
دوشیزائیں بِکتے دیکھیں
چاول کے دانوں کی خاطر
اکثر مائیں بِکتے دیکھیں
میں کلکتے سے آیا ہوں

سیاسیات

یہ گیت گانے دے

وہ انقلاب جو آیا غلام ملکوں میں
مچی ہے دھوم سی جس کی تمام ملکوں میں

وہ انقلاب کہ ہے نام جس کا آزادی
وہ ایک دور ہے پیغام جس کا آزادی

وہ انقلاب جو دشمن ہے فرقہ بندی کا
جو اک ستارہ ہے قوموں کی سر بلندی کا

وہ انقلاب کہ سرمایۂ غریبی ہے
جو اہلِ زر کی بلندی کی بد نصیبی ہے

وہ انقلاب جسے مفلسی نے پالا ہے
غلام قوم کی قسمت کا جو اُجالا ہے

مرے وطن میں وہی انقلاب آنے دے
نہ روک مجھ کو غلامی یہ گیت گانے دے

سبھاش کا مادرِ وطن سے خطاب

اے مادرِ وطن تری ناموس کے لئے
قربانی و خلوص کے پرچم اڑاؤں گا
عزم و وفا کی شمع فروزاں لئے ہوئے
محکومیوں کے دور کی ظلمت مٹاؤں گا
روشن کروں گا تیرے فسانوں کو دہر میں
میں تیری عظمتوں کے حسیں گیت گاؤں گا
میری رگوں میں تیرا لہو ہے رواں دواں
رگ رگ کو تیرا سازِ ترنم بناؤں گا
جب غیر کے لبوں پہ ترا نام آئے گا
اپنی عقیدتوں کے خزانے لٹاؤں گا
جاپانیوں کو جرمنوں کو روسیوں کو میں

اپنے تخیلات کی رَو میں بہاؤں گا

دی آسماں نے فرصتِ ہستی اگر مجھے

ہر دشمنِ وطن کو میں نیچا دکھاؤں گا

سب سر جھکائیں گے مری تعظیم کے لئے

ایسی ادائے عجز سے میں سر اُٹھاؤں گا

تیرے لئے کیا ہے جو اے مادرِ وطن

اس عزمِ استوار کو رنگیں بناؤں گا

لاؤں گا تیرے واسطے یا جنسِ حریت

یا جیتے جی کبھی یہاں واپس نہ آؤں گا

ظلم جس وقت عام ہوتا ہے

وجہِ صد انتقام ہوتا ہے

اس میں ہوتے ہیں انقلاب جواں

ملک جو بھی غلام ہوتا ہے

آزاد ہند فوج کے قیام پر

سبھاش کی تقریر

ایثار کی تڑپ ہو رگ و پے میں موجزن
حُبّ وطن کے نام پہ جانیں لٹا دیجئے
یہ وقت ہے کہ چھینئے خورشید سے جلال
ذرّوں کو آفتاب کا ہمسر بنائیے
جھانسی کی خاک آج بھی کہتی ہے برملا
مردانگی یہی ہے کہ میدان میں آئیے
ہندوستاں کی شانِ گزشتہ ہے مقتضی
پہلی روایتوں کو نہ دل سے بھلائیے
دہلی کا لال قلعہ ہے اس انتظار میں
اس پر وطن کا پرچمِ رنگیں اڑائیے

اُٹھیں قدم تو منزلیں حائل نہ ہو سکیں

میدانِ حریت میں قدم یوں اُٹھائیے

یوں کیجئے مقابلہ ہر غیر فوج سے

سکہ بہادری کا دلوں پر بیٹھائیے

پیتے ہیں جامِ خونِ غریبی جو شوق سے

اُن کو شرابِ مرگ کے ساغر پلائیے

اُٹھئے اور انقلاب کی بادِ شدید سے

جور و جفا کی شمعِ فروزاں بجھائیے

ہندوستانیوں کو ہو آزادیوں سے پیار

آزاد ہند فوج کا نعرہ لگائیے

جی میں آتا ہے کہ دولت کے پجاری سے کہوں

اب ترے عہد کا نزدیک زوال آتا ہے!

ذکر جب بزم میں چھڑ جاتا ہے آزادی کا

مجھ کو برسوں کی غلامی کا خیال آتا ہے

نیتا!

آزاد ہند فوج کا نیتا سبھاش بوس
آزادیٔ وطن کا نگہباں کہیں جسے
اس کی ہر ایک کوششِ پنہاں تھی وہ علاج
ہندوستاں کے درد کا درماں کہیں جسے
رخصت ہوا تھا اپنے وطن سے وہ اک فقیر
غربت نصیب بے سر و ساماں کہیں جسے
قربانی و خلوص کا وہ نقشِ بے مثال
تخئیلِ جسم و جاں سے گریزاں کہیں جسے
تھی اس کی ہر ادا میں کچھ ایسی کشش نہاں
اہلِ نگاہ جاذبِ دوراں کہیں جسے

خاکِ وطن کو اس کی تجلّی پہ ناز ہے

وہ ایک ذرّہ مہرِ درخشاں کہیں جسے

اس گلستاں کی جان تھا وہ دلنواز پھول

اربابِ ذوق فخرِ گلستاں کہیں جسے

اُس نوجواں کی زندگی تھی یوں ضیا فروش

ظُلمت کدے کی شمعِ فروزاں کہیں جسے

اُس کا ہر ایک لفظ تھا وہ سوزِ انقلاب

رُودادِ انقلاب کا عنواں کہیں جسے

کتنے سفینہ ہائے غلامی ڈبو گئی

وہ ایک موجِ حاصلِ طوفاں کہیں جسے

مجبور کے اشکوں کی روانی دیکھی

مظلوم کی خونابہ فشانی دیکھی

زردار کے چہرے کا تبسّم دیکھا!

روتے ہوئے مُفلس کی جوانی دیکھی

سبھاش کی طرح

صد شورِ انقلاب کی دُنیا لیے ہوُئے
آزادیٔ وطن کی تمنّا لیے ہوئے
ایثارِ بے بہا کا تقاضا لیے ہوُئے
سینہ سپر ہند ہِلیں کا ہر ایک نوجواں
سو سبھاش کی طرح

صدقِ طلب میں فکرِ جوانی سے بے نیاز
عیش و نشاط و غم کی کہانی سے بے نیاز
آہ و فغاں سے، نغمہ فشانی سے بے نیاز
ہر ایک نوجوان ہو سالارِ کارواں
سو سبھاش کی طرح

جذبے شہادتوں کے نگاہوں سے ہوں طلوع
بیتابیاں سکوں کی پناہوں سے ہوں طلوع
آثار منزلوں کے یوں راہوں سے ہوں طلوع
دل ہوں سراغ ہائے منازل کے راز داں
سوبھاش کی طرح

سہگل پہ شہنواز پہ ڈھلوں پہ ناز ہو
دل میں خلش ہو درد ہو سوز و گداز ہو
در قصرِ حُرّیت کا غلاموں پہ باز ہو
اہلِ وطن مٹائیں غلامی کا ہر نشاں
سوبھاش کی طرح

نہیں جاتی غریبوں کی پریشانی نہیں جاتی
مرے غم آفریں اشکوں کی طغیانی نہیں جاتی
غم و افلاس کے مارے ہوئے مزدور کی صورت
خداوندانِ مال و زر سے پہچانی نہیں جاتی

اَے شاعرِ زمانہ

اے شاعرِ زمانہ پھر چھیڑ یہ ترانہ
نغمے محبّتوں کے گانے لگے زمانہ

سرشار ہوں ہوائیں مسرور ہوں فضائیں
ہر میکدے پہ چھائیں مستی بھری گھٹائیں
ایسی بہار آئے کانٹے بھی مسکرائیں
رنگِ وفا میں بدلیں احباب کی جفائیں

بے رنگ زندگی کا رنگین ہو فسانہ
اے شاعرِ زمانہ پھر چھیڑ یہ ترانہ

ہر چیز جگمگائے اُلفت کا نور چھائے
مِٹ جائیں نفرتوں کے ظُلمت فروش سائے

مندر بھی مُسکرائے مسجد بھی مُسکرائے
تلخی کا کوئی جھونکا پھر اس طرف نہ آئے
اور جھوم کر تجھے یہ کہنے لگے زمانہ
اے شاعرِ زمانہ پھر چھیڑ یہ ترانہ

آرائشِ نظر ہو تہذیب کی جوانی
دورِ سکوں میں بدلے یہ دورِ آسمانی
تکمیلِ کامرانی ہو اس وطن کی رانی
دن بھی ہوں روح پرور راتیں بھی ہوں سُہانی
اے شاعرِ زمانہ پھر چھیڑ یہ ترانہ
نغمے محبّتوں کے گانے لگے زمانہ

ساون کے جو آثار سحابی ہونگے
ڈورے مری آنکھوں میں گلابی ہونگے
جس قوم کی قسمت میں خرابی ہوگی
اُس قوم کے شاعر بھی شرابی ہونگے

میں تو بدلوں گا

نظامِ آسماں بدلے نہ بدلے میں تو بدلوں گا
یہ رفتارِ جہاں بدلے نہ بدلے میں تو بدلوں گا
بہاروں میں خزاں بدلے نہ بدلے میں تو بدلوں گا
فضائے گلستاں بدلے نہ بدلے میں تو بدلوں گا
نہ بدلے گردشِ دوراں مجھے پروا نہیں اس کی
مزاجِ آسماں بدلے نہ بدلے میں تو بدلوں گا
نہ بدلے برہمن ناقوس کے کہنہ ترانے کو
یہ مُلّا کی اذاں بدلے نہ بدلے میں تو بدلوں گا
مسرت کی جوانی کو الم میں ڈھونڈھنے والے
تری آہ و فغاں بدلے نہ بدلے میں تو بدلوں گا
نہ بدلے تو رفیقانہ روش میں زندگی اپنی
ترا طرزِ بیاں بدلے نہ بدلے میں تو بدلوں گا
بدلنا ہے مجھے ہندوستاں کو اس ارادے سے
مرا ہندوستاں بدلے نہ بدلے میں تو بدلوں گا

آثارِ انقلاب

اونچے اونچے ایوانوں کے
بام و در ہیں گرنے والے
سرکش اور مغرور دھڑوں سے
ظلم کے سر ہیں گرنے والے
سیمیں سیمیں زرّیں زرّیں
سارے گھر ہیں گرنے والے
ظالم و جابر شہبازوں کے
بال و پر ہیں گرنے والے
شاہی درختوں کی شاخوں سے
برگ و ثمر ہیں گرنے والے
چرخِ ملوکیت کے تارے
دھرتی پر ہیں گرنے والے
ذرّوں کی معراج یہی ہے
شمس و قمر ہیں گرنے والے

نئی صُبح

وقت نے چھیڑا ساز نرالا

لرز رہا ہے کانپ رہا ہے
آج غلامی کا ہر مندر

ایک نئے سُورج کی کرنیں
جھانک رہی ہیں اسکے اندر

ظُلمت میں پھر ہُوا اُجالا
جھُوم اُٹھا ہے کوہ ہمالہ

کام جو بم بھی کر نہ سکینگے
گاندھی کی تلوار[۱] کرے گی

مشرق سے آواز اُٹھے گی
مغرب کو بیدار کرے گی

ہم پر شاہی اور سُلطانی
تخت و تاج نثار کرے گی

جاگ اُٹھے اب ہندوستانی
جھُوم اُٹھا ہے کوہ ہمالہ

وقت نے چھیڑا ساز نرالا

[۱] عدم تشدّد

زندگی کی دوڑ

خلفشارِ بزمِ عالم دیکھئے
چشمِ گردوں بھی ہے پُرنم دیکھئے

ہوگئی تکمیلِ سوزِ عاشقی
آنسوؤں میں ڈھل گیا غم دیکھئے

کس بلندی پر اُڑا جاتا ہوں میں
پست ہیں اب ہر دو عالم دیکھئے

ابنِ آدم کی ستمرانی سے آج
ہے نظامِ زیست برہم دیکھئے

انقلابی زندگی کی دوڑ میں
سب سے پیچھے رہ گئے ہم دیکھئے

سُلگتے تقاضے

سُلگتے تقاضے ذرا اور سُلگیں
اُٹھیں چند شعلے جلیں چند ایواں
فروزاں ہوں صدیوں کے تاریک ارماں
سُنہرے سمندر میں آئیں مسلسل
جنوں خیز جوشیلے، بھڑکیلے طُوفاں
لبوں پہ ہوں انصاف پرور فسانے
بدستِ غریبی ہوں زرّیں گریباں
سُلگتے تقاضے ذرا اور سُلگیں
اُٹھیں چند شعلے جلیں چند ایواں

گلچین مغرب

اُٹھے گی آہ جب مظلوم کے دل سے دُھواں ہو کر
زمیں گردش میں آئے گی خلافِ آسماں ہو کر
قفس کی تیلیاں بھی رہ گئیں وقفِ فغاں ہو کر
کہ بجلی مسکرائی ہے نصیبِ آشیاں ہو کر
چمن اپنا ہے لیکن پھول ہیں گلچینِ مغرب کے
ہم ایسی باغبانی کر رہے ہیں باغباں ہو کر
وہ آزادی کے دشمن ہیں غلامی کے پجاری ہیں
بنے اغیار کے جو دشمنِ ہندوستاں ہو کر
نہ پاکستان ملتا ہے نہ آزادی نہ خالصتاں
سیاست رہ گئی اپنی فقط وہم و گماں ہو کر
مجھے تو آشیاں کو آگ دینے کی تمنّا ہے
پلٹ جاتی ہے کیوں بجلی قریبِ آشیاں ہو کر
یہ کس منزل کی جانب لے چلا ہے ذوقِ منزل کا
کہ ہر منزل سفر میں ہے شریکِ کارواں ہو کر

پلٹ دو زمانہ

بدل دو فضائیں پلٹ دو زمانہ
چلن اس زمانے کا ہے باغیانہ
تری زندگی کا یہی ہے فسانہ
قضا ڈھونڈ لیتی ہے کوئی بہانہ
عداوت کا عالم ارے توبہ توبہ
محبّت بنی جا رہی ہے فسانہ
فلک کی طرف جب اُٹھائیں نگاہیں
جلانے لگیں بجلیاں آشیانہ
تجھے مجھ سے نسبت تھی جب اے جوانی
پلٹ کر نہ آیا وہ گزرا زمانہ

کوہِ ہمالہ

زہے کوہ ہمالہ عظمتیں تیرے فسانے کی
تجھے گردش میں لا سکتی نہیں گردش زمانے کی

بہر لحظہ پیامِ امن دیتی ہے زمیں مجھ کو
کہ باحالِ پریشاں آج تک دیکھا نہیں تجھ کو

مزاجِ وقت بدلا چرخ بدلا تُو نہیں بدلا
قیامت چونک اٹھیگی اگر تُو بھی کہیں بدلا

تری یہ استقامت آئینہ دارِ بلندی ہے
تری شانِ بلندی ایک معیارِ بلندی ہے

کہ جس کی سمت ہے مائل توجہ آسمانوں کی
جسے انوار میں ڈوبے ہوئے اُجلے نشانوں کی

مہ و خورشید کے جلوے طواف عام کرتے ہیں
عقیدت کی نگاہوں سے تجھے پرنام کرتے ہیں

چراغاں رات بھر کرتی ہے بزم کہکشاں تجھ پر
چمک اپنی لٹاتے ہیں ستاروں کے جہاں تجھ پر

ترے قدموں کو دھونے جب سمندر اُڑ کے آتا ہے
عقیدت سے حسیں اشکوں کے کچھ دریا بہاتا ہے

تو برفانی ہواؤں کی کڑی سردی بھی سہتا ہے
عجب ہے صابر و شاکر کہ پھر خاموش رہتا ہے

تری دھن ادم کا منتر ہے بھارت کے شوالے میں
ترے درشن کئے دُنیا نے بھگتی کے اُجالے میں

پُرانا سنت ہے تو اور نرالی شان ہے تیری
حوادث چھو نہیں سکتے جسے وہ آن ہے تیری

مگن ہے تو سمادھی میں حسیں تیری سمادھی ہے
کہ دور از گردشِ چرخ و زمیں تیری سمادھی ہے

تری آغوش میں کھیلا زمانے کا حسیں بچپن
بلوغ و ارتقائے زندگی کا دِل نشیں بچپن

ترے چہرے سے ہر دم ایک ہستی سی برستی ہے
وہ ہستی جس کی ہر اک موج اک تاریخِ ہستی ہے

تری آنکھوں میں ہیں سب کروٹیں گذرے زمانے کی
کہ ہر بیتی صدی ہے اک کڑی تیرے فسانے کی

ہزاروں خونچکاں صدیوں کے تو نے خواب دیکھے ہیں
لہو سے موجزن دریاؤں کے سیلاب دیکھے ہیں

تری آنکھوں نے دیکھا ہے وہ رشیوں کا زمانہ بھی
تجھے ہے یاد اس دورِ تمدّن کا فسانہ بھی

کہ جب بیدوں کے منتر سے فضائیں جھوم اُٹھتی تھیں
خوشی کی سرسراہٹ سے ہوائیں جھوم اُٹھتی تھیں

رواں تھیں دُودھ کی نہریں ہر اک نعمت فراواں تھی
یہی بستی وہ بستی ہے کبھی جو خلد ساماں تھی

یہاں جو لوگ تھے ناواقفِ رسمِ غلامی تھے
جفا نا آشنا انساں رواداری کے حامی تھے

یہاں ادراک کے پرچم فضا میں مسکراتے تھے
متاعِ علم لینے دُور سے سیاح آتے تھے

برہمن سامراجی زندگی کو پاپ کہتے تھے
یہ انسانوں کی نگری تھی یہاں انسان رہتے تھے

نہ اس دھرتی نے دیکھا تھا بدیشی تاج کا سایہ
سُدیشی زندگی پر تھا سُدیشی راج کا سایہ

وہ روحانی زمانہ علم و حکمت کا زمانہ تھا
کہ سب کا مقصدِ اعلیٰ بصیرت کو جگانا تھا

مگر اب دیکھ تو اس دیش کے افلاس کا منظر
اُمیدوں کی نگاہوں میں ہجومِ یاس کا منظر

جہاں آزادیاں تھیں اب وہاں ننگِ غلامی ہے
نگاہِ حُریت میں یہ وطن ننگِ غلامی ہے

مرے بنگال میں انساں اتنے گن نہیں سکتے
اُٹھائے موت نے طوفان اِتنے گن نہیں سکتے

پڑی ہیں رہگذارِ عام پر اب بھی کئی لاشیں
بدیشی دل پہ کیا گذرے جو جی اُٹھیں یہی لاشیں

یہ لاشیں دیکھ کر بھی سرد تیری گرمجوشی ہے
تری گہری سمادھی بزدلی ہے یا خموشی ہے؟

ہمالہ! نامناسب ہے سکوتِ بے محل تیرا
بدل سکتا ہے طرز زندگی طرزِ عمل تیرا

اگر تو جاگ اُٹھے انت ہو جائے غلامی کا
لگے وہ آگ گھر جلتا نظر آئے غلامی کا

لپک اُٹھیں جہاں میں انقلابی آگ کے شعلے
بھڑکتی آگ کے شعلے سُلگتے راگ کے شعلے

جو تو جاگے تو ایسا انقلاب آئے زمانے میں
نہ ہو رنگِ مظالم ابنِ آدم کے فسانے میں

دو رُخ

راج محل کی آنکھیں روشن
دولت کی پازیب کی چھن چھن

ہر جانب اک نور فشانی
دن سے بڑھ کر رات سہانی

پیری پر بھی نئی جوانی
قدموں میں ہے سکھ کی رانی

مفلس کی کٹیا ہے ایسے
اندھی رات کی آنکھیں جیسے

فاقوں نے کھینچے وہ خاکے
بچّوں کی آنکھوں کے آنسو

تاریکی میں اور اضافے
آہ و حسرت غم کی باتیں

اُف پردیس میں رنگِ غُربت
بیت گئیں افسوس میں راتیں

اے سب کی تقدیر کے مالک
دُنیا کی تصویر کے مالک
پُوچھ رہی ہے آج بغاوت
ایک کی قسمت جلوہ جلوہ
ایک کی قسمت ظُلمت ظُلمت
دیکھ رہا ہے تو یہ منظر
تیرا دل ہے یا اِک پتھر

گھر گھر جلے چراغ

گھر گھر میں دیوالی آئی

گھر گھر جلے چراغ

غربت کی دلسوز کہانی — آنکھ میں آئی بن کر پانی
اشکوں سے کب بجھ سکتے ہیں — مفلس کے سینے کے داغ

گھر گھر جلے چراغ

جیون کے رنگیں افسانے — عشرت کے زریں پیمانے
زرداروں کی قسمت میں ہیں — مفلس کی قسمت میں داغ

گھر گھر جلے چراغ

کھانے کو بچہ جب ترسے — آنکھ سے غم کا بادل برسے
آنکھوں پر ویرانی چھائے — اجڑیں آشاؤں کے باغ

گھر گھر جلے چراغ

خونی بدلی

وقت نے کیسی آگ لگائی
پچھم پر سرخی سی چھائی

جس میں خون ہے انسانوں کا — اک نقشہ ہے ارمانوں کا
جاگے کالے ناگ ہزاروں — ڈسنے والے ناگ ہزاروں
وقت نے کیسی بین بجائی — پچھم پر سرخی سی چھائی

پانچ ہیں اس شطرنج کے مہرے — دو پر تینوں ٹوٹ پڑے ہیں
ایک کے بھاگ ہی پھوٹ گئے ہیں — دھرتی سب رنگین ہوئی ہے
وقت نے ایسی راس رچائی — پچھم پر سرخی سی چھائی

پورب سے آواز اٹھی ہے — پریم کا لے کر ساز اٹھی ہے
سانجھے جیون کو اپناؤ — سانجھی لے میں سب ڈھل جاؤ

یہ سرخی بھی ہٹ جائے گی
خونی بدلی چھٹ جائے گی

تصویریں

جگا سکتے نہیں اپنے وطن کی خُفتہ تقدیریں
غلامی کے صنم خانے کی ہیں ہم لوگ تصویریں
غلامی کے مقدّر کو بدل سکتی ہیں تدبیریں
وہ تدبیریں کہ جن میں زندگانی کی ہوں تنویریں
مرے اشعار کے ہر لفظ سے جو آشکارا ہیں
یہی ہیں زندگی کے راز کی اے کیفؔ تفسیریں

ہر سازِ مظالم کی صدا ختم کرو
ہر طرزِ ستم، طرزِ جفا ختم کرو
آزادیٔ عالم کے پجاری بن کر
دُنیا سے غلامی کی وبا ختم کرو

فلسفۂ جنگ

جنگ ہے شوق کے مسکاتے ہوئے گیت کی تان !
جنگ ہے موت کے اٹھتے ہوئے طوفاں کا نشان
جنگ ہے ظلم کے آغاز کے انجام کا رنگ
خون کی پیاس لئے پھرتا ہے اس جام کا رنگ
جنگ تعمیر کی تخریب کا انداز بھی ہے
جس کے پردے میں نہاں سوز بھی ہے ساز بھی ہے
جنگ فطرت کے مقاصد کو عیاں کرتی ہے
جنگ انسان کی ہمت کو جواں کرتی ہے
جنگ اقوامِ زمانہ کی شجاعت کا نشاں
عظمت و شوکت و سطوت کی شہادت کا نشاں

جنگ شاہوں کو بھکاری بھی بنا سکتی ہے
جنگ ہٹلر کو مئے مرگ پلا سکتی ہے
جنگ مظلوم کو پیغام ہے بیداری کا
جنگ احساس ہے کھوئی ہوئی خودداری کا
جنگ تہذیب کا تہذیب سے ٹکرانا ہے
جنگ مجموعی تصادم میں اُلجھ جانا ہے
جنگ سرمایہ پرستی کے لئے آفت ہے
شیشہ و جام کی ہستی کے لئے آفت ہے
جنگ ہے قومی تسلط کا جنونِ پیہم
جنگ ہے نسلی تعصّب کا فسونِ پیہم
جنگ عنوان ہے اس دَور کے افسانے کا
زِندگی نام ہے تقدیر سے ٹکرانے کا

راج محل

مُفلس کی کُٹیا کے کارن
راج محل بدنام ہُوا ہے
صدیوں کی تاریک کہانی
انسانوں کی ہے نادانی
جاگے گی عقلِ انسانی
قصرِ امارت گر جائے گا
وقت کو یہ الہام ہُوا ہے
مُفلس کی کُٹیا کے کارن
راج محل بدنام ہُوا ہے

چراغ جلے ہیں

ہندستاں کا دکھتا سینہ — داغوں سے بھرپور ہے ابتک
سامراج مغرور ہے ابتک — اپنے نشے میں چور ہے ابتک
دشمن مرا مجبور ہے ابتک — جو منزل ہے اپنی منزل
وہ منزل بھی دور ہے ابتک — دیوالی کی شب آئی ہے
ظلمت میں کچھ داغ جلے ہیں — کون کہے یہ چراغ جلے ہیں
مفلس کے گھر اندھی چھایا — راجہ کے گھر سکھ کی مایا
کھیر مٹھائی پوری حلوے — آنکھوں میں جنت کے جلوے
مفلس کے گھر فاقہ مستی — جیون مہنگا موت ہے سستی
راج محل میں ہے دیوالی — مفلس کا گھر دیپ سے خالی
ظلمت میں کچھ داغ جلے ہیں — کون کہے یہ چراغ جلے ہیں

مُحبانہ روش

خبر اخبار میں پڑھ کر کسی مسجد کے جلنے کی
میں ہندو ہوں مگر آنکھوں میں آنسو آ ہی جاتے ہیں
مجھے اسلام کا بھی پاس ہے اے محرمِ اُلفت
کہ بادل غم کے میری زندگی پر چھا ہی جاتے ہیں

محبت کیش مُسلم کو بھی سُن کر رنج ہوتا ہے
کسی مندر کو جب برباد کر دیتے ہیں دیوانے
اگر اک دُوسرے کے درد کو ہم لوگ اپنا ئیں
تو بن جائیں حدیثِ دوستی یہ تلخ افسانے

مرے اہلِ وطن کی تلخیوں کا ہے یہی باعث
کہ یہ اپنی محبانہ روش کو بھول بیٹھے ہیں
نہ جانے ان پہ جادُو چھا گیا کس کی سیاست کا
کہ یہ اپنی رفیقانہ روش کو بھول بیٹھے ہیں

چورنگی تصویر

سارے جہاں میں دُھوم ہے گاندھی کے نام کی
پھیلی ہُوئی ہے روشنی اس کے پیام کی
آزاد کے کلامِ بلاغت نظام پر
رہتی نہیں کسی کو ضرورت کلام کی
عبدالغفار خان کی اللہ رے عظمتیں
آتی ہیں ہر طرف سے صدائیں سلام کی
میرے وطن کو ایسے جواہر پہ ناز ہے
حسرت نہیں ہے جس کی تجلّی کو بام کی

اشتراکیت

گندم کے دانے سے اُگتی ہے یہ جیون کی پھلواری
مشرق کے الہامی نغمے مغرب کی ایجادیں ساری
مُلّا اور پنڈت کی باتیں مُکتی کے در کھول رہی ہیں
جیون کے دُکھ ساگر میں یہ سُکھ کا امرت گھول رہی ہیں
بھوُکے انسانوں کو پھر بھی گندم ہے ان سب سے پیاری
گندم کے دانے سے اُگتی ہے یہ جیون کی پھلواری

مذہب

تن کا بھوجن ہے یہ گندم من کا بھوجن ہے رُوحانی
تو سمجھا ہے تن کو سب کچھ یہ ہے تیری اِک نادانی
تن ہے فانی من ہے باقی تن نے من کی سار نہ جانی
تیری بے سمجھی پر میری آنکھوں میں بھر آیا پانی
جیون کا سنتوش نہیں تو بھوُکے ہیں راجہ اور رانی
میری امر کہانی سُن کر تو ہو جائے گا لافانی

بھارت کا گیت

بھارت ورش کے رہنے والے
آپس میں ہیں سارے ایک!
جیسے پھول چمن کے ایک ہیں
جیسے عرش کے تارے ایک

یوں تو پھول چمن کے سارے
دکھائی دیتے ہیں نیارے
پھر بھی ایک چمن ہے سب کا
ایک کے ہیں یہ پیارے ایک
جیسے عرش کے تارے ایک

یوں تو سارے عرش کے تارے
کھلائی دیتے ہیں نیارے
پھر بھی ایک ہی عرش ہے سب کا
ایک ہی کے ہیں یہ تارے ایک

بھارت ورش کے رہنے والے
آپس میں ہیں سارے ایک

ایک ہے دیپک ایک ہے باتی
ایک ہے سب کے تن کی ماٹی
ایک ہے سب کی دھرتی ماتا
ایک کے راج دلارے ایک

جیسے پھول چمن کے ایک ہیں
جیسے عرش کے تارے ایک

بک جاتے ہیں

لالچ کے بازار میں آکر
چاندی کے ٹکڑوں کے بدلے
لاکھوں تن من بک جاتے ہیں
بک جاتے ہیں حسن و صورت
حسن کی عصمت بک جاتی ہے
جنسِ محبت بک جاتی ہے
عشق کی چاہت بک جاتی ہے
لاکھوں جیون بک جاتے ہیں
لالچ کے بازار میں آکر
چاندی کے ٹکڑوں کے بدلے
نام خدا کا بک جاتا ہے
مُلّا نے ایمان کو بیچا
پنڈت نے بت خانے بیچے
صدیوں کے افسانے بیچے
بھگتی کے کاشانے بیچے
اپنے دھرم کی شان کو بیچا

راگ میں بھر دے آگ جوانی

اپنے عزیز دوست مسٹر پرکاش چندر جین کی رسمِ سہرا بندی پر

پیشِ نظر ہے دورِ غلامی — اُف یہ محرومی، ناکامی
عشق پریشاں حُسن پریشاں — سہمی نظریں سہمے ارماں
چھائی ہے افلاس کی بدلی — قحط کی بدلی یاس کی بدلی
دُولہا دُلہن دونوں حیراں — سارا بھارت ہے اِک زنداں
خواب سے اُٹھ اور جاگ جوانی — راگ میں بھر دے آگ جوانی
سرد فضا کو گرم بنا دے — قصرِ غلامی بڑھ کے جلا دے

دُور کرے جو غمِ غلامی
مَیں ہوں اُس سہرے کا حامی

برطانوی وزارتی مشن سے خطاب

آؤ اور دیکھو:-

آنے والو آؤ دیکھو

صدموں سے پامال وطن کو
چاک گریباں انسانوں کو
فاقوں سے بے حال وطن کو
اُجڑے اُجڑے کاشانوں کو

آنے والو آؤ دیکھو

دیکھو افسردہ اور حیراں
شامِ غم سے صُبحِ ہستی
تڑپ رہی ہے سسک رہی ہے
بھُوکے انسانوں کی بستی
جیون ہے اس دیس میں مہنگا
موت ہے اس بازار میں سستی

آج بغاوت پر آمادہ!
ہے مزدور کی فاقہ مستی
اُف یہ زرداری کے نغمے
اُف یہ غلامی اور یہ پستی
آنے والو آؤ دیکھو

دیکھو اور مُسکاتے جاؤ
ہندوستاں کی محرومی پر
گھڑیاں گھڑیاں مظلومی پر

واپس جاؤ:—

دیکھ چکے اب واپس جاؤ
واپس جاؤ پھر مت آنا
انگلستاں کے عیاروں کو
جا کر سارا حال سُنانا
کہنا آزادی کی خاطر
ہندُستاں بیتاب بہت ہے

ٹُوٹ گیا گو خوابِ غلامی
پھر بھی طلسمِ خواب بہت ہے

پھُوٹ ابھی تک ہے کچھ زندہ
نفرت ہے پنجاب میں باقی
زہر بھری صہبا کے ساغر
بانٹ رہا ہے بوڑھا ساقی

لیکن آزادی کے ارماں
روکے سے اب رُک نہ سکیں گے
ایٹم بم کے خوف سے بھی اب
ہندُستانی جھُک نہ سکیں گے

ہندُستاں کو دو آزادی
ورنہ ہو گی وہ بربادی
جس کے ذمہ دار نہیں ہیں
ہندُستاں کے وہ فریادی
جن کا مسلک ہے آزادی

محوری اور اتحادی

انقلابِ وقت کی انگڑائیاں ہیں دیدنی
گردشِ ایام کی پرچھائیاں ہیں دیدنی

ایک دن ہٹلر کی فوجیں برسرِ پیکار تھیں
اور فضائیں اس کے طیاروں سے شعلہ بار تھیں

ایک دن اٹلی کی قسمت تھی مسولینی کے ہاتھ
ایک دن جاپان کی ٹکر تھی امریکہ کے ساتھ

آج کوئی محوری قوت نہیں سرگرمِ کار
اتحادی کر رہا ہے اتحادی کو شکار

آیا ہولی کا تہوار

آیا ہولی کا تہوار
رنگ بھرے بازار ہیں ساجن
رنگ بھرے بازار

دھن والوں کے نین گلابی — مدھ ماتے اور نیم شرابی
مفلس کے جیون پر بار — کال، غلامی اور غریبی

یہ ہے داسوں کا سنسار
آیا ہولی کا تہوار

آیا ہولی کا تہوار

زندہ باد مری سرکار — پھر تڑپے بھوکے انسان
گولی اور لاٹھی سے ہوگا — کتنی جانوں کا نقصان؟
پھر تڑپے گا ہندستان — تجھ کو ان باتوں سے مطلب؟

اپنے مطلب سے کر پیار
آیا ہولی کا تہوار

ہلالِ عید

ہندیوں نے جس قدر کی غیر کی تقلید اور
ہو گیا خالی وطن کا دامنِ اُمید اور
سرزمینِ ہند جب آزاد تھی دلشاد تھی
آسمانِ ہند پر تب تھا ہلالِ عید اور
اے غلامانہ تصوّر اے غلامانہ نظر
ماہِ آزادی کے جلووں کا ہے لُطفِ دید اور
ختم ہو جاتا ہے سُن کر جس کو شاہوں کا جلال
حُرّیت کے باب کی ہوتی ہے وہ تمہید اور
جس کے پرتو سے چراغاں ہے جہانِ زندگی
ماورائے ماہ و انجم ہے کوئی خورشید اور

حسینِ غنچہ

صالح محمد صدیق مدیر "اجیت" کے نورِ نظر کو دیکھ کر

کھلا ہے اک حسین غنچہ ترے باغِ محبت میں
اضافہ کر دیا جس نے ترے لطف و مسرت میں
ہنسی بے ساختہ ہے اور خوشی معصوم ہے جس کی
یہ اک ننھی سی صورت زندگی معصوم ہے جس کی
غمِ سود و زیاں سے دور ہے جس کی حسیں دنیا
قدم جس کے زمیں پر ہیں مگر خلدِ بریں دنیا
اسے معلوم کیا ہو یہ وطن محکوم ہے کب سے
قفس میں ہیں چمن والے چمن محکوم ہے کب سے
یہاں فرقہ پرستی نت نئے طوفاں اٹھاتی ہے
یہاں الفت کی باتوں پر بھی تلخی منہ دکھاتی ہے

یہاں شہری ترقی اور تمدن خواب ہیں ابتک
غرض پنجاب والے دشمنِ پنجاب ہیں ابتک

یہ حالت دیکھ کر پنجاب کی مایوس ہوں ہمدم
مگر میں رحمتِ یزداں سے بھی مانوس ہوں ہمدم

کسے معلوم یہ بچہ جواں ہو کر زمانے میں
اضافہ بخش ثابت ہو اُمیدوں کے فسانے میں

کرے یہ قسمتیں بیدار اپنے دیس والوں کی
بسائے اک نئی دُنیا محبت کے خیالوں کی

وہ دُنیا جس میں انسانیتوں کی شادمانی ہو
خُدا کی مہربانی ہو تو ایسی زندگانی ہو

اس دور میں شاعر نے سخن بیچا ہے
گلہائے معانی کا چمن بیچا ہے
وہ اہلِ وطن دشمنِ آزادی ہے
ٹکڑے کے لئے جس نے وطن بیچا ہے

تقدیسِ علم

ذرات میں مخفی ہے وہ تابندہ حرارت
خورشید صفت برق کی رخشندہ حرارت

جو دات کو تاروں میں چمکتی ہے فلک پر
اور بزمِ عناصر میں ہے بجلی سے بھی برتر

ذرّوں سے جو حکمت نے کیا اُس کو فراہم
تیار ہُوا موت کا اعجاز نما بم

جاپان کے اِک شہر پہ جب اُس کو گرایا
میلوں ہی فضاؤں پہ دُھواں موت کا چھایا

انسان بہت موت کی آغوش میں سوئے
اور اہلِ نظر اس نئی ایجاد پہ روئے

تدبیر کو تقدیر بنا سکتا ہے انساں
حکمت سے ستاروں پہ بھی چھا سکتا ہے انساں

پھر موت کے ساماں میں اضافہ ہے حماقت
ہے علم کی تقدیس کا مفہوم رفاقت

تدبیر کی کہانی

ماحول بے وفا ہے گریاں ہے زندگانی
ہر ایک لب پہ جاری ہے دُکھ بھری کہانی
ہر گام پر ہے ماتم اخلاق و آگہی کا
اب خاک مسکرائے تہذیب کی جوانی
تجدیدِ بے وفائی کے عہد کی بدولت
رسمِ وفا بھی اے دل اب ہو گئی پرانی
بے عزم و پست ہمت انسان کر رہے ہیں
تقدیر کی شکایت تدبیر کی زبانی
اسلوب مٹ گیا اُن رنگیں رفاقتوں کا
ہر اختلاف جن سے تھا وجہِ شادمانی
اے کاش پھر سے حاصل ہو دُکھ بھرے جہاں کو
اسلاف کا چلن اور اُلفت کی کامرانی

آنسو بھر آئے

جگ کا جیون کیا مُسکائے

سکھ کا ایسا کال پڑا ہے بندہ بندے کو کھا جائے
داسوں کے سنسار پہ چھائی ساہراج کی کالی چھایا
یہ کیسا انیائے ہے بھگوان یہ کیسی ہے تیری مایا
آنکھوں میں آنسو بھر آئے
جگ کا جیون کیا مسکائے

ہر کشتی کا ایک کنارہ ایک کاٹھ کی ہر اک نیّا
مُسلم جس کو اللہ سمجھا ہندو اس کو کرشن کنہیا
دونوں لڑ کر خود پچھتائے
جگ کا جیون کیا مُسکائے

نظارے نئے نئے

طوفاں نئے نئے ہیں کنارے نئے نئے
دل ڈھونڈھتا ہے آج سہارے نئے نئے

پیشِ نظر ہیں آج نظارے نئے نئے
گردش میں آرہے ہیں ستارے نئے نئے

آیا جو انقلاب تو دُنیا بدل گئی
دُنیا کے رنگ ڈھنگ ہیں سارے نئے نئے

اس دور میں شاعر کا گلا بکتا ہے
پیسوں کے لئے نغمہ ہرا بکتا ہے
انسان کے بکنے کا تو کیا ذکر ہے کیفؔ
بازارِ مذاہب میں خدا بکتا ہے

نئی راہیں

ذرا تو دیکھ دُنیا نے نئے انداز بدلے ہیں
نئے نغمہ گروں نے اب پُرانے ساز بدلے ہیں

نئے مقصد نئی ہمت نئی منزل نئی راہیں
نکالی ہیں زمانے نے ترقی کی کئی راہیں

پھر افکار کی ہیں اب اُڑانیں آسمانوں پر
اُڑائیں خاک کے ذروں نے تانیں آسمانوں پر

مگر میرے وطن پر ہے جمودِ زندگی طاری
ابھی اس بزم میں باقی ہے غفلت کی فسوں کاری

ابھی ڈوبی نہیں ہیں حسن کی تفسیر میں نظریں
اُلجھ کر رہ گئی ہیں زلف کی زنجیر میں نظریں

ابھی اپنے مسائل پر نہیں ڈالی نظر ہم نے
ابھی دیکھی نہیں اپنی ترقی کی سحر ہم نے

بہم دست و گریباں ہے ابھی اہلِ وطن اپنے
ابھی محروم ہیں سوزِ سخن سے ہم سخن اپنے

ابھی بدلا نہیں ہے ہم نے اپنی کج ادائی کو
نہیں تازہ کیا اپنی رسومِ آشنائی کو

لباسِ گل ابھی خاروں کو پہنانا نہیں سیکھا
ابھی محفل میں ہم نے پیار کا گانا نہیں سیکھا

سماجی زندگی اپنی اسیرِ یاس ہے اب تک
نہ اپنے کا نہ بیگانے کا ہم کو پاس ہے اب تک

دل بکتا ہے تن بکتا ہے جاں بکتی ہے
بازار میں ہر جنسِ گراں بکتی ہے
اس دَور میں بک جاتا ہے شاعر کا ضمیر
اس دَور میں شاعر کی زباں بکتی ہے

گیت

کیوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر
ہم لوگ لڑائی لڑتے ہیں
ہر گام پہ راہِ اُلفت میں
کیوں ذکرِ جُدائی کرتے ہیں

جو محفل ہمیت کی محفل ہے
کیوں اس میں سیاسی تلخی ہے
رُوداد لبوں پر لاتے ہیں
خوش رنگ ترانوں کے بدلے
بے رنگ ترانے گاتے ہیں

کیوں ذکرِ جُدائی کرتے ہیں
آپس میں لڑائی کرتے ہیں

طرب انگیز و دلشاد و غزلخواں ہو بھی سکتے ہیں

جو ہم چاہیں تو فخرِ بزمِ امکاں ہو بھی سکتے ہیں

چمک اُٹھے جو حسنِ آگہی سے عقل کا چہرہ

نقوشِ ذہنِ انسانی درخشاں ہو بھی سکتے ہیں

مذاقِ دید ہی اپنا ابھی کچھ خام ہے ورنہ

بیابانِ جہاں رشکِ گُلستاں ہو بھی سکتے ہیں

سکوں کے منتشر اجزا کو ہم یکجا اگر کر لیں

پریشانی کے شیرازے پریشاں ہو بھی سکتے ہیں

وہ اسرارِ نہاں تعمیر ہیں جو ربطِ باہم کی

ترا حسنِ عمل بن کر نمایاں ہو بھی سکتے ہیں

سلوکِ دل نشیں، آدم نوازی، پرسشِ باہم
ہماری داستانوں کے یہ عنواں ہو بھی سکتے ہیں

اُلجھ کر رہ گئی ہے بزمِ دوراں جن کی اُلجھن میں
وُہی عقدے بفیضِ عقل آساں ہو بھی سکتے ہیں

بدل سکتی ہے شیرینی میں ہر بے کیفیٔ تلخی
مسائل زندگی کے کیف ساماں ہو بھی سکتے ہیں

بدل جائے جو رنگِ بے رُخی رنگِ ندامت میں
پشیماں کرنے والے خود پشیماں ہو بھی سکتے ہیں

اگر بیدار ہو جائیں کمالِ اُنس کے جذبے
یہی انساں شریکِ دردِ انساں ہو بھی سکتے ہیں

دلوں پر بارشِ لطف و کرم ہو گر نگاہوں سے
جہنم زارِ ہستی خُلد ساماں ہو بھی سکتے ہیں

محبت میں شکستِ ضبط ننگِ ضبط ہے ورنہ
یہی آنسو علاجِ دردِ پنہاں ہو بھی سکتے ہیں

سوامی رام تیرتھ

لبوں پر مسکراہٹ آنکھ سر مستی کا پیمانہ
ادائیں بیخودی کا آئینہ انداز مستانہ

تری تحریر میں مستی تری تقریر میں جادو
تری تصویر کو دیکھا تری تصویر میں جادو

ملا جب ویدکی الفت کا تجھ کو جام عرفانی
سرور جاوداں میں مٹ گئی دل کی پریشانی

مسلماں اور ہندو نے تجھے دیکھا محبت سے
کہ تیری باطنی نظروں کو نسبت تھی حقیقت سے

تجھے امریکنوں نے پیار کی آنکھوں سے دیکھا ہے
ترا جلوہ دل بیدار کی آنکھوں سے دیکھا ہے

تو اپنے حسن کے جلوے کا پروانہ نظر آیا
جو دیوانہ بنا ڈالے وہ دیوانہ نظر آیا

تجھے گنگا کی موجوں نے لیا آغوشِ ہستی میں
تری ہستی بسی جا کر کسی پُر نور بستی میں

کمالِ شوق تھی اے رام یہ تابندگی تیری
کہ دل کی زندگی تھی درحقیقت زندگی تیری

عشرت و کیف سے خالی ہے جوانی تیری
غم کے آغوش نے پالی ہے جوانی تیری
جس جوانی پہ برستی ہے جوانی کی بہار
اُس جوانی سے نرالی ہے جوانی تیری

غمِ زمانہ

دامن اگر جفا کا ہاتھوں سے چھوٹ جائے
آزادیٔ وطن ہو زنجیر ٹوٹ جائے
بے کیفیاں ہیں جس میں وہ جام پھوٹ جائے
اس باغ سے خزاں کے جھونکوں کی لوٹ جائے

اے شاعرِ زمانہ اب چھیڑ یہ ترانہ
بدلے مسرتوں میں اپنا غمِ زمانہ

مجلس کی دلکشی میں سب کا مزاج بدلے
انسانیت کی خاطر تلخی کا راج بدلے
اک دو کا ذکر کیا ہے سارا سماج بدلے
کل کی خبر ہے کس کو یہ بزم آج بدلے

اے شاعرِ زمانہ اب چھیڑ یہ ترانہ
بدلے مسرّتوں میں اپنا غمِ زمانہ

ہر من میں یہ لگن ہو اب اپنا بھاگ جاگے
سوئی محبّتوں کا سویا سہاگ جاگے
پھر سوز و ساز جاگے پھر رنگ راگ جاگے
نفرت کی آگ سوئے اُلفت کی آگ جاگے

اے شاعرِ زمانہ اب چھیڑ یہ ترانہ
بدلے مسرّتوں میں اپنا غمِ زمانہ

دنیا میں پھر چلن ہو مذہب کے بانیوں کا
پھر تذکرہ ہو ان کی روشن کہانیوں کا
پھر حُسن مسکرائے جادو بیانیوں کا
اقرار ہو بشر کو ربّی نشانیوں کا

اے شاعرِ زمانہ اب چھیڑ یہ ترانہ
بدلے مسرّتوں میں اپنا غمِ زمانہ

اسیری

مزہ ہے بحرِ حوادث میں یوں بھی جینے کا
کہ موج موج تعاقب کرے سفینے کا
نظر اسیر، تخیل اسیر، شوق اسیر
یہ زندگی ہے تو کیا فائدہ ہے جینے کا
لُٹی لُٹی سی جوانی بجھے بجھے سے خیال
غموں نے چھین لیا لُطف مجھ سے جینے کا

یہ چاند یہ گلشن یہ نظارے یہ ہوا
یہ جذب یہ مستی یہ محبت کی فضا
ہر تشنہ تمنا کا تقاضا ہے یہی
اے ماہِ وفا ساغرِ مہتاب پلا

دیوالی

نہ آ خدا کے لئے میرے مُلک ویراں ہیں
مرا پیام ہے یہ تیرے نام دیوالی
جبینِ شرق پہ اب تک ہے داغِ محکومی
مرے وطن کی سحر بھی ہے شام دیوالی
غلام قوم کے تہوار بھی غُلام ہیں آج
غلام عید ہے اپنی غلام دیوالی
دِیا جلانے کی توفیق بھی نہیں مجھ کو
تجھے ہے دُور سے میرا سلام دیوالی
کہیں تو اور ہی جا کہ مقام کر اپنا
ترا مقام نہیں یہ مقام دیوالی

بجھا ہُوا ہے وطن کا چراغِ آزادی
منائیں خاک جہاں میں غلام دیوالی
جلیں گے ہند میں جس دم چراغِ آزادی
پلائے آئے گی مستی کے جام دیوالی
نہ آفتاب ہے میرا نہ ماہتاب مرا
مری نگاہوں میں اب تک ہے خام دیوالی
مٹا تھا راونِ مغرور تو منائی تھی
بھرت نے رام کی آمد پہ عام دیوالی

کسی کی بزم میں جانے کے میں نہیں قابل
کہ میں ہوں خاک نشیں اور سفید پوش نہیں
ہے فخر و ناز مجھے کیف اس غریبی پر
کہ میں غریب بھی ہو کر وطن فروش نہیں

مُفلس کی دیوالی

آنکھوں میں میخانے لے کر　　پھُولوں کے پیمانے لے کر
دیپک اور پروانے لے کر

گھر گھر میں دیوالی آئی
آئی رونق والی آئی

آنکھوں پر اُجیارے چھائے　　سورج چاند ستارے چھائے
ہنستے ہوئے نظارے چھائے

نُور کی لے کر تھالی آئی
آئی رونق والی آئی

سب نے اس کی مہما گائی　　سب کے من کی جوت جلائی
سب کے گھر میں خوشیاں لائی

میرے گھر میں خالی آئی
گھر گھر میں دیوالی آئی

سالِ رفتہ

دمِ رخصت کہا سالِ رواں سے سالِ رفتہ نے
کہ میرے عہد میں چمکی نہیں قسمت زمانے کی
مری آنکھوں نے دیکھی خونِ انسانی کی ارزانی
رہے جنگ و جدل ہی سُرخیاں میرے فسانے کی
نہ بدلی عرش کے تاروں نے اپنی خُوں بہا گردش
اگرچہ میں نے کوشش کی مظالم کو مٹانے کی
رہی ناکام پیشِ آسماں میری سیاست بھی
نہ دی مجھ کو اجازت آسماں نے مسکرانے کی
دعا دیتا ہوں میں تجھ کو دمِ رخصت مرے ہمدم
کہ امن و آشتی ہوں سُرخیاں تیرے فسانے کی

سالِ نو

خوشی ہو گیا مجھے سالِ رواں تیری روانی کی
کہ محکومی ہے سُرخی آج بھی میری کہانی کی

میں سُنتا ہوں نشاطِ زندگانی بھی کوئی شئے ہے
جھلک دیکھی نہیں لیکن نشاطِ زندگانی کی

مقامِ حُرّیت سے دُور ہیں میرے قدم اب تک
اذیت سہہ رہا ہوں میں کسی کی حکمرانی کی

ضیا اُمّید کی مایوسیوں نے چھین لی لیکن
تمنّا ہے مرے دل کو نویدِ کامرانی کی

اگر بخشی تری رحمت نے مجھ کو جنسِ آزادی
ادائیں یاد رکھوں گا میں تیری مہربانی کی

نہ چمکی عہد میں تیرے اگر میری سیہ بختی
تو یہ توہین ہے سالِ رواں تیری روانی کی

کنارے

یہ موجیں یہ طوفاں یہ پانی کے دھارے
کنارے کہاں تک رہیں گے کنارے

دوامی نہیں اس جہاں کے نظارے
کوئی دم کے مہماں ہیں یہ چاند تارے

زہے دیس کے اُس پجاری کا جینا
کئی سال جیلوں میں جس نے گزارے

سمجھتے نہیں ضبطِ غم کا اشارہ
ہیں معصوم کتنے یہ آنسو ہمارے

ہر اک موجِ طوفاں یہ کہتی ہے مجھ سے
سفینے بمشکل لگیں گے کنارے

آتشِ انقلاب

نئے نظام کی بزمِ کہن سے ہو گی جھڑپ
دلِ عوام کی پُرسوز و پُرخلوص تڑپ
مدد کرے گی لگانے میں انقلاب کی آگ
نہاں ہے غم کے فسانے میں انقلاب کی آگ

کسی کے دل کی تمنا کے دشمنِ جانی
خدا کرے نہ میسر ہو تجھکو وُہ پانی
جو آئے کام بجھانے میں انقلاب کی آگ
نہاں ہے غم کے فسانے میں انقلاب کی آگ

لبِ غریب پہ آئی دبی دبی سی فغاں
اُٹھا ہے دیکھ سُنہری عمارتوں سے دھُواں
سُلگ رہی ہے زمانے میں انقلاب کی آگ
نہاں ہے غم کے فسانے میں انقلاب کی آگ

مجلسیات

تڑپ رہے ہیں سجود

نہ اب وہ عہدِ گذشتہ نہ اس کے بند و قیود
چراغِ دیر و حرم میں وہ روشنی ہے کہاں
خدا کے لفظ میں پہلی سی دلکشی ہے کہاں
تڑپ رہی ہے عبادت سسک رہے ہیں سجود
نہ منزلیں نہ مسافر نہ راستے نہ حدود!!

تھا جن پہ ناز ہمیں اب وہ نظریے نہ رہے
نئی حیات کے سانچے میں ڈھل گئے ہم تم
چلیں ہوائیں کچھ ایسی بدل گئے ہم تم

وہ اُلفتیں وہ نگاہیں وہ سلسلے نہ رہے
کہ زندگی کے وہ پہلے سے زاویئے نہ رہے

نصیب گردشِ دوراں ہُوئے وہ افسانے
کہ جن کے فیض سے ہم تم وفا شعار رہے
تمام ہندُو و مُسلم رفیق و یار رہے
کسی نے لُوٹ لئے وہ حسین مے خانے
مئے خلوص کے لاکھوں تھے جن میں پیمانے

دل امیروں کا موم کر نہ سکے
مُضمحل آنسوؤں کے افسانے
انقلابات لیں گے انگڑائی
ٹوُٹ جائیں گے زر کے پیمانے

دیہاتی دُنیا

اِک چوپال میں کچھ دیہاتی
بولے آج بسنت کا دن ہے
پھولوں کی وہ دیوی آئی
اور خزاں کے انت کا دن ہے

ایک مسلماں ہنس کر بولا
یہ بھی ہے تہوار خوشی کا
اِک ہندو نے یہ فرمایا
عید بھی تھی تیوہار خوشی کا

گیانی جی بھی زور سے بولے
خوب کیا اظہار خوشی کا
اُن کی باتوں سے ہیں سمجھا
بُغض ہے پردہ دار خوشی کا

بُغض تعصّب کا ہے بھائی

دونوں سے ہے تنگ خدائی
شہری دُنیا ان سے نالاں
اِن کا ہے عنوان جُدائی

پر ان دونوں کی چالیں بھی
شہری دُنیا تک ہیں بھائی
اپنی دیہاتی دُنیا میں
ان دونوں کی ہے رسوائی

اپنے دیس کے دیہاتی ہیں
کتنے سیدھے سادے انساں
اپنے مذہب پر ہیں قائم
عام ہے ان میں دھرم اور ایماں

آپس میں ہے پریت کا ناطہ
آنکھ میں اُلفت لب ہیں خنداں
ان کی سادہ سی باتوں پہ
ساری شہری دُنیا قرباں

مدھر گیت

میرے مدھر گیت سے ساجن
جھوم اُٹھا سنسار

جھوم اُٹھے سب چاند ستارے
نور کی موجیں نور کے دھارے
کھل گئے من کے پریم دوار
جھوم اُٹھا سنسار

میرے مدھر گیت سے ساجن
ناچ اُٹھی ترلوکی ساری
گھنگرو باندھ کے ناچی مایا
پلٹ گئی جیون کی کایا
گیت بنا سانسوں کا تار
جھوم اُٹھا سنسار

ہو جس میں بُوئے عشق و بد اُس ایمان کے صدقے
محبت جس کی ہو تعلیم اُس قرآن کے صدقے
جو دل میں درد رکھتا ہے میں ایسے شخص کے قرباں
ادائے اُنس جس میں ہے میں اُس انسان کے صدقے
جو عالمگیر جذبوں کے لئے ہو مرکزِ اُلفت
میں ایسی دوستانہ زندگی کی شان کے صدقے
نتیجہ جس کا دُنیا کے لئے ہو باعثِ راحت
میں اُس اعلان کے صدقے میں اُس فرمان کے صدقے
مخالف کی بھی سُن کر جو محبّت کیش رہتا ہے
میں اُس کی اِس حیاتِ مجلسی کی شان کے صدقے

زمانہ بدلے گا

نظام گردشِ لیل و نہار بدلے گا
مسرتوں میں غمِ روزگار بدلے گا
یہ دورِ اے دلِ غفلت شعار بدلے گا

یہ کہہ رہا ہے فضاؤں میں میرا پیار ابھی زمانہ اور بھی بدلیگا ایک بار ابھی

سرور چھائیگا آنکھوں میں غم کے جانے سے
قرار آئے گا مستی بھرے ترانے سے
اُٹھے گی لاش مظالم کی جب زمانے سے

اُسی زمانے کا مجھ کو ہے انتظار ابھی زمانہ اور بھی بدلیگا ایک بار ابھی

چھڑے گی اہلِ سیاست میں بات مجلس کی
شگفتہ ہوگی جہاں میں حیات مجلس کی
سحر میں بدلے گی آخر یہ رات مجلس کی

طلوعِ مہر جو ہوگا سحر نگار ابھی زمانہ اور بھی بدلیگا ایک بار ابھی

سب سے پہلے

مِلّتیں اس نظریئے سے ہیں قریباً متفق

اس جہاں میں سب سے پہلے آدمی پیدا ہُوا

دفعتاً خوابِ عدم سے آنکھ فطرت کی کھُلی

ذرّے ذرّے میں جمالِ آگہی پیدا ہُوا

جب عناصر میں ہوئی پیدا محبّت کی تڑپ

بزمِ آب و گِل میں ربطِ باہمی پیدا ہُوا

زندگی تنہائیاں محسوس جب کرنے لگی

دل میں احساسِ فروغِ مجلسی پیدا ہُوا

جس کے فیضانِ مسلسل سے درخشاں ہے حیات

دُشمنی میں کب وہ حُسنِ دوستی پیدا ہُوا

آدمیت پر مشیت پھُول برسانے لگی

بزمِ ہست و بود میں جب آدمی پیدا ہُوا

وہ تلخ تر ہوا چلی

وفاؤں کے دیار میں، وہ تلخ تر ہوا چلی
کہ ہر امید و شوق کی، تڑپ اُٹھی گلی گلی

محبتیں ہیں سرنگوں
دلوں کا ہو گیا ہے خوں
ہے اختلاف میں فزوں
وہ دشمنی نما فسوں
سیاستیں ہیں اک جنوں
رفاقتیں ہیں بے سکوں
سنوں بھی میں تو کیا سنوں
کہوں بھی میں تو کیا کہوں

جفاؤں کا ہے سامنا، ہے شور یہ گلی گلی
ہوں دوستی نوازیاں، کھلے اُمید کی کلی
کہ تلخیوں کا زور ہے، وہ تلخ تر ہوا چلی

عرفانیات

عشق نے بخشی یہ مُشتاقی
دُنیا فانی اللہ باقی
اُلفت بادہ مستی ساقی
شیشہ اور پیمانہ کیسا

چلتی پھرتی ہیں تصویریں
یہ تصویریں ہیں تقدیریں
کام نہ آئیں کچھ تدبیریں
بستی اور ویرانہ کیسا

نغمے سے دل کیا بہلاؤں
رونا ہے تو کیا مُسکاؤں
تیرے جلووں میں کھو جاؤں
اپنا اور بیگانہ کیسا

وہ کارواں نہیں ہے

اسرارِ مہر خوشی کا محرم جہاں نہیں ہے
ورنہ کسی کا مقصد آہ و فغاں نہیں ہے

ہر پھول جس کا اُلجھے کانٹوں سے خار بنکر
کانٹوں کی سرزمیں ہے وہ گلستاں نہیں ہے

اُلفت جواں تھی جب تک دل بھی جواں تھا اپنا
اُلفت جواں نہیں تو دل بھی جواں نہیں ہے

اے میرِ کارواں یہ کیا انقلاب آیا
وہ راستے وہ منزل وہ کارواں نہیں ہے

کس درجہ ہو چکی ہے رُسوا تری کہانی
تیرے لبوں پہ تیری اب داستاں نہیں ہے

بے تلخ ہوں نہ جب تک یہ مجلسی فضائیں
آزادیوں کے قابل ہندوستاں نہیں ہے

اہلِ سائنس

خرد کی صلاحیتوں کو جگائیں
اُڑیں اور تاروں کی دُنیا پہ چھائیں
ہیں بیتاب چلنے کو ایسی ہوائیں
جو اُلفت میں بدلیں گی شہری فضائیں
دلوں میں اُجاگر کرو وہ اُمنگیں
جو سانجھی اُمنگوں کی دُنیا بسائیں
نظر سے نظر مل گئی تو مزا کیا
مزا جب ہے دل کو بھی دل سے ملائیں
اسی سوچ میں ہیں ابھی اہلِ مغرب
کہ چاند اور سورج پہ قبضہ جمائیں

قمر جلال آبادی

ترے رسیلے نشیلے، جوان گیتوں میں
وہ درد ہے کہ جسے سوزِ انقلاب کہوں
سرورِ صدق و وفا ہے ترے سخن کی جھلک
میں تیرے شعر کو کیوں مستیٔ شراب کہوں
جہانِ علم و ادب کا ہے تو وہ اک ذرّہ
جسے زبانِ عقیدت میں آفتاب کہوں
ترا خیال ہے سرمایۂ فسونِ شباب
غلط نہیں جو تجھے شاعرِ شباب کہوں
ہر ایک بزمِ وطن میں ہے ذکرِ عام ترا
فضائے ملک میں گونجا ہے خوب نام ترا

بُرائی

ہندو ہے بُرا اور نہ مسلمان بُرا ہے
آجائے بُرائی پہ تو اِنسان بُرا ہے

مُسلم سے کہا غیر نے ہندو ہے منافق
ہندو سے کہا دیکھ مسلمان بُرا ہے

ہے صلح پسندی میں نہاں نشانِ فضیلت
لڑنا تو کسی سے بھی مری جان بُرا ہے

جبرئیل سے اچھا ہے جو انسان ہے اچھا
ابلیس سے بدتر ہے جو انسان بُرا ہے

خود شیخ و برہمن کی نظر خام ہے ورنہ
اللہ بُرا اور نہ بھگوان بُرا ہے

سکوتِ غم

کر گیا محوِ فغاں میرے سکوتِ غم کو
موسمِ گُل میں عنادل کا غزلخواں ہونا

میرے افلاس کی توہین کا اک منظر ہے
اُن کے ایوانِ امارت کا چراغاں ہونا

آدمی جزو ہے ملت کا تو ملت کی قسم
باعثِ رنج ہے ہندو کا مسلماں ہونا

حُسن و رومان کی دنیا ہے مرے دل کیلئے
چاندنی رات میں ہر پھول کا خنداں ہونا

تجھ کو اے کیف نہیں اپنی حقیقت معلوم
ورنہ آسان ہے ذرّے کا بیاباں ہونا

اُلفت کی نگری

اُجڑ گئی اُلفت کی نگری

مسجد میں بھی شور مچا ہے
مندر میں بھی شور
جیون کے رس کا دھن سارا
جھلمل کرتا پریت نظارا
لوٹ کے لے گئے چور — اُجڑ گئی اُلفت کی نگری
یہ کیسا انیائے ساتھی
یہ کیسا انیائے
پریم سبھا سنسان پڑی ہے
یہ بستی ویران پڑی ہے
سُکھ پہ چھائے دُکھ کے سائے — اُجڑ گئی اُلفت کی نگری

منزل

کسی کے نقشِ قدم جھلملا اُٹھے اے دوست
چمک رہی ہے فلک پہ وہ کہکشانِ جمیل
نہ جانے کون سی منزل کی آرزو لے کر
رواں دواں ہیں ستاروں کے کاروانِ جمیل

میں سوچتا ہوں کہ نوعِ بشر کی منزل بھی
زبانِ راز میں آواز دے رہی ہوگی
ذرا سی بات پہ آپس میں تلخیوں کی حدیث
رہِ حیات میں اِک سنگِ دشمنی ہوگی
ہر امتیاز اگر بے سرور و کیف رہا
جہاں میں اور بھی تذلیلِ آدمی ہوگی
پہنچ سکیں گے نہ منزل پہ رہروانِ جمیل

کسی کے نقشِ قدم جھلملا اُٹھے اے دوست
چمک رہی ہے فلک پہ وہ کہکشانِ جمیل

لاہور

میرے دوست مسٹر پرکاش چندر جین نے مجھے خط لکھا جسمیں انہوں نے لاہور کو جنت الارضی سے موسوم کیا ہے۔ یہ نظم اسی خط کے تاثر کا نتیجہ ہے

تُو نے دیکھا ہے یہاں سرمایہ داری کا فسُوں
میں نے دیکھا ہے یہاں مُفلس کا باحال زبُوں
تیری آنکھوں میں تبسّم ہے مری آنکھوں میں خُوں
تُو نے کیوں لاہور کو جنّت لکھا میرے ندیم

دَور میں دیکھے ہیں تُو نے ساغر و مینا یہاں
حُسن کی رنگیں بہاروں کے مہکتے گلستاں
میں نے دیکھا بیکسوں کے دل کی آہوں کا دھُواں
تُو نے کیوں لاہور کو جنّت لکھا میرے ندیم

میں نے اس بستی میں دیکھی زندگی بکتی ہُوئی
بیکسی بیچارگی آزُردگی بکتی ہُوئی
مہ جبینوں گلرخوں کی دوستی بکتی ہُوئی
تُو نے کیوں لاہور کو جنّت لکھا میرے ندیم

یہ وہ خطّہ ہے کہ جس کو دوزخِ ہستی کہیں
درد کی آلام کی فریاد کی بستی کہیں
اہلِ زر کی چیرہ دستی عقل کی پستی کہیں
تُو نے کیوں لاہور کو جنت لکھا میرے ندیم

اس چمن میں نام کو بُوئے وفا باقی نہیں
جام اس محفل کے خالی ہیں مگر ساقی نہیں
رقص و نغمہ عام ہیں طغیانِ مشتاقی نہیں
تُو نے کیوں لاہور کو جنّت لکھا میرے ندیم

ہندو و مسلم میں باہم پیار کی باتیں نہیں
مختلف الرائے لوگوں میں ملاقاتیں نہیں
کیف افزا دن نہیں اور غم رُبا راتیں نہیں
تُو نے کیوں لاہور کو جنّت لکھا میرے ندیم

مسکنِ نفرت پرستی ہے تمہارا لاہور دیکھ
مجلسی ماحول کو اس کے بچشمِ غور دیکھ
عہدِ اُلفت کی بجائے تلخیوں کا دور دیکھ
تُو نے کیوں لاہور کو جنّت لکھا میرے ندیم

شالامار

ماضی کی نظروں سے دیکھا
میں نے شالامار کا میلا

مادھو لال حسین بھی دیکھے
وہ مستانے نین بھی دیکھے

جن میں ایسی نا بانی تھی
جو باقی تھی لافانی تھی

ماضی کی نظروں سے دیکھا
دھرتی پر اک لاش پڑی ہے

لال حسین بھی آنکلے ہیں
ہاتھ دعا بن کر اٹھے ہیں

صوفی کے اعجاز کو دیکھا
فقر کے اس انداز کو دیکھا

مادھو مر کر جی اٹھا ہے
سارے دیس میں یہ چرچا ہے

عشق نے یوں بدلیں تقدیریں
بول اٹھیں بے جاں تصویریں

عہدِ ماضی

زہے وہ عہدِ محبت کہ تھی نگاہوں میں
حسیں لبوں کی تبسّم فشانیوں کی جھلک

تھی ماہ و انجم و خورشید سے جمیل بہت
جہانِ مہر و وفا کی جوانیوں کی جھلک

ہر ایک گام تھا صد منزلِ سرور و نشاط
قدم قدم پہ تھی وہ شادمانیوں کی جھلک

فغاں بلب تھیں بہاریں نہ بے سرور خزاں
ہر ایک رنگ میں تھی گلفشانیوں کی جھلک

ضیا فروش تھی موجِ خیال یوں جیسے
ہو چاندنی میں سمندر کے پانیوں کی جھلک

اُڑا کے صرصرِ آلام لے گئی اے دوست
سکون و امن کی اُجلی نشانیوں کی جھلک

جفا و جور نے کی ہے وہ سازشِ پنہاں
وفا کے پاس نہیں کامرانیوں کی جھلک
وہ شانِ عہدِ حسیں کاش پھر پلٹ آئے
نفس نفس میں ہو پھر شادمانیوں کی جھلک

اے دوست

برُوٹے کار ہیں کچھ ایسی تلخیاں اے دوست
ہے جن سے بزمِ محبت دھواں دھواں اے دوست
کشیدگی سے ہے ماحول زندگی کا اُداس
کشیدگی سے ہے برہم سکونِ جاں اے دوست
کشاں کشاں نہ رہیں آدمی اگر باہم
ہو انبساط کی دُنیا جواں جواں اے دوست
بجا کہ دیر و حرم کے رسُوم ایک نہیں
مگر ہے ایک خداوندِ دو جہاں اے دوست

فکرِ جمیل

وقت مغموم ہے بے کیف ہیں تقدیر کے رنگ
ہر نفس درد سے معمور ہے مسرور نہیں
منزلیں تیرہ و تاریک ہیں راہیں موہوم
ظلمتِ یاس میں امید فزا نور نہیں

ہیں ابھی پیشِ نظر بزمِ سیاست کے سوال
خونِ تہذیب ابھی اور بھی سستا ہوگا
موت کے گھاٹ ابھی اتریںگی لاکھوں جانیں
بند تدبیر پہ تقدیر کا رستا ہوگا

سینکڑوں داغ ابھی اور فروزاں ہوں گے
دامنِ غم کی ابھی اور نمائش ہو گی
عارضِ زیست ابھی اور بھی ہو گا نمناک
چشمِ پُرنم کی ابھی اور نمائش ہو گی

ہم اگر چاہیں تو آلام کی تخلیق نہ ہو
اک نئے دَور کی تشکیل ہو یہ فکرِ جمیل
امتیازات میں ہو ربط نوازی کی جھلک
رنگ تخریب کا تعمیر میں ہو یوُں تبدیل

دل کی ناکام اُمنگیں نہ ہوں محرُوم اگر
تلخیاں ہوں نہ وفاؤں کی عناں گیر کبھی
آشنایانہ فسانے ہوں لبوں کی زینت
اپنا انداز نہ ہو باعثِ تحقیر کبھی

سوال

آدمی درد سے محروم ہے ایسا کیوں ہے
زندگی ظالم و مظلوم ہے ایسا کیوں ہے
کوئی حاکم ہے زمانے میں تو کوئی محکوم
آدمی حاکم و محکوم ہے ایسا کیوں ہے
ایک کے لب پہ تبسم ہے نظر میں جلوے
ایک افسردہ و محکوم ہے ایسا کیوں ہے
ایک کے ہاتھ میں ہے جام اور اک ہے محروم
ہمنشیں تجھ کو یہ معلوم ہے ایسا کیوں ہے؟

سعیِ باہم

سعیٔ باہم سے اگر عقدے ہوں حل اپنے تمام
کشتۂ جورِ غلامی ہو نہ جائیں شادکام
رہبرانِ قوم آپس میں اگر ہوں متفق
پایۂ تکمیل کو پہنچے مذاقِ ناتمام
پا بجولانی کا دیرینہ تسلسل ٹوٹ جائے
ہوں پر افشانی پہ مائل طائرانِ زیرِ دام
ہم اگر حسنِ تدبر سے ذرا بھی کام لیں
کجروی اور بے رخی کا ہو جہاں سے اختتام
آدمی تبدیل کر سکتا ہے حسنِ ربط سے
بزمِ عالم کا جفا انگیز و فرسودہ نظام

شکوۂ ایام

ہر قوم کو وابستۂ آلام کیا ہے
نفرت نے زمانے میں یہی کام کیا ہے
خود ہندو و مسلم نے جفا کیش روش سے
تقدیسِ مذاہب کو بھی بدنام کیا ہے
بے مہر جفاؤں نے ہمیں راہِ طلب میں
ناشاد کیا ہے کبھی ناکام کیا ہے
کچھ غیر نے بخشی ہے ہمیں ذلتِ پیہم
کچھ اپنی روش نے ہمیں بدنام کیا ہے
کیوں شکوۂ ایام کرے نوعِ بشر پھر
جب اس نے غمِ دہر کو خود عام کیا ہے

سُرخیٔ افسانہ

نہ شادماں ہیں نگاہیں نہ پُر سرُور ہیں دل
حدودِ مہر و محبت سے دُور دُور ہیں دل

ہر امتیاز میں تلخی کا رنگ شامل ہے
نہ آگہی ہے جواں اور نہ شوق کامل ہے

یہی رہے گا اگر رنگِ محفلِ ہستی
نصیب ہو گی بلندی کو اور بھی پستی

پڑے گا امن زمانے کا اور خطرے میں
الم سے ہو گا مسرت کا دَور خطرے میں

یہ سازِ وقت کی آواز ہے کہ ہم بدلیں
ستم کرم میں اور آسودگی میں غم بدلیں

نہ ایک سعیٔ مسلسل ہو سلسلہ جُنباں
رہے نہ دشمنِ انسانیت کوئی انساں

ہر امتیاز گوارا ہو دوستی کے لئے
یہی ہے سُرخیٔ افسانہ زندگی کے لئے

امن و جنگ

عصرِ حاضر کی بہیمانہ روش تو دیکھو
گورِ تہذیب پہ گریاں ہے وفاؤں کا ہجوم
شادماں اور غزلخواں ہے جفاؤں کا ہجوم

اِک نئی جنگ کے امکان ابھی باقی ہیں
مرگ کے اور بھی طوفان ابھی باقی ہیں

جنگ کا دیو نگل جائے گا انسانوں کو
ہوش اتنا بھی نہیں غرب کے فرزانوں کو

جنگ ایوانِ محبّت کو مٹا دیتی ہے
آگ یہ امن کے خرمن کو جلا دیتی ہے

ردِّ بلا

اک مہیب اور سیہ بھوت نہ جانے کب سے
محفلِ زیست کو مرہونِ ستم رکھتا ہے
اس کی نظروں میں ہے خوں ریز ہلاکت کی نمود
دشمنِ ربط ہے عالم کے لئے اس کا وجود
جنگ ہوتی ہے جہاں بھی یہ قدم رکھتا ہے
اس نے تعمیر کو تخریب میں بدلا ہے ضرور
اس کی ہیبت سے ہوا خشک بہاروں کا لہو
شبنمی نقش بنا چاند ستاروں کا لہو
اس نے توڑا ہے طربناک فضاؤں کا غرور

ہم جو چاہیں اسے آفاق سے رخصت کردیں
امتیازات میں تلخی کا نشاں تک نہ رہے
مائلِ جور و جفا کوششِ انساں نہ رہے
اپنے انداز میں اک رنگِ محبت بھر دیں

مشرقِ وقت

دامنِ زیست پہ وہ داغ نمایاں ہے ابھی
جس نے بدنام کیا عقل کے دیوانوں کو

خلعتِ فتنہ و شر جس نے عطا فرمائے
مغربی عہد کے خاموش ستمرانوں کو

جس نے اُکسایا ہے تخریب کی بیداری سے
بزمِ ایجاد کے مشہور نگہبانوں کو

اِذن سے جس کے ہُوا عالمِ تہذیب تمام
جس نے مسمار کیا امن کے کاشانوں کو

جس سے غرقاب ہُوئی کشتیِ ربطِ باہم
دعوتیں جس سے ملیں موت کے طوفانوں کو

ایک چشمک سے کیا جس کی تجلّی نے فنا
جنگ کے خوف سے سہمے ہوئے انسانوں کو

دامنِ زیست سے وہ داغ بھی مٹ سکتا ہے
مائلِ جور اگر کوششِ انساں نہ رہے
ایک بھی موج نہ ساحل کو ڈبونے آئے
رُخ ہواؤں کا اگر شاملِ طوفاں نہ رہے
صرصرِ تلخیٔ بے جا کو اگر روک سکیں
گیسوئے مہر و مروّت بھی پریشاں نہ رہے
مشرقِ وقت سے وہ مہرِ درخشاں ہو طلوع
زندگی کو گلۂ ظلمتِ دوراں نہ رہے

مذہبیات

گیتا

تو ہے ابدی اور لافانی ۔۔۔ سب چیزیں ہیں آنی جانی
کایا ۔ مایا ۔ روپ ۔ جوانی ۔۔۔ تجھ پر چھائی کیوں حیرانی
سوچ سمجھ کر کھیل جگت میں ۔۔۔ جیون کا ہر کھیل پرانی

تو ڈوبے جو آتم رس میں ۔۔۔ موت بھی ہو پھر تیرے بس میں
جیتنا اور بھے سے ہو نیارا ۔۔۔ گیتا کا ہے یہی اشارا
کیسی آشا اور نراشا ۔۔۔ جیون ہے بس ایک تماشا

گیتا کا یہ گیت امر ہے ۔۔۔ ہار ہے فانی جیت امر ہے
تجھ میں جاگ اٹھے وہ بھگتی ۔۔۔ تجھ میں آجائے وہ شکتی
نین تیرے امرت برسائیں ۔۔۔ اگنی ۔ سورج ۔ چاند ستارے

تیرے قدموں پہ جھک جائیں

بنسری

لو پھر بجی وہ بنسری
کہ جھوم اٹھی ہے زندگی
فضاؤں میں بکھر گئے
وہ نغمہ ہائے سرمدی
نظر نظر پہ چھا گئی
بہار بن کے بےخودی

وہ سیلِ رنگ و نور ہے
سرشار ہی سرور ہے

مسرتوں کے نور سے
فضائے غم نکھر گئی
مچل گئیں جوانیاں
وہ چاندنی بکھر گئی
سرور نا لبوں پہ ہیں
سرور نا اکھاتیاں
ہٹی ہے سب فسردگی
یہ کون مسکرا دیا
کہ کائنات ہنس پڑی

لو پھر بجی وہ بنسری
کہ جھوم اٹھی ہے زندگی
گوال بال خوش ہوئے
فسُردہ حال خوش ہوئے
دلوں میں پھر سلگ پڑی
دبی دبی، بجھی بجھی
رسیلی آگ پریت کی
جو آنسوؤں کا سوز ہے
جو درد اَور گداز ہے
جو زندگی فروز ہے

وہ رس بھری صدا اُٹھی
لو پھر بجی وہ بنسری
اُٹھو اُٹھو، سنو سنو
یہ کہہ رہی ہے زندگی
بڑھے چلو بہادرو
وہ منزل نصیب ہے
جہاں ہیں شادمانیاں
وہ دور بھی قریب ہے
ہیں جس میں کامرانیاں

سانولی صورت

مدھ بھری بنسری کی تان کے ساتھ
مستیوں کے ہجوم ناچ اُٹھے
زندگی کے شراب خانے میں

گیت بن کر سرور چھایا ہے
رنگ برسا ہے نور چھایا ہے
ایک جادو ہے مسکرانے میں
مستیوں کے ہجوم ناچ اُٹھے
زندگی کے شراب خانے میں

مدھ بھری بنسری کی تان کے ساتھ
بے خودی کی زبان پہ آتے
حسن کی جلوتوں کے افسانے
جھلملاتے ہیں آئینہ خانے
زندگی کے شراب خانے میں
ایک جادو ہے مسکرانے میں

مدھ بھری بنسری کی تان کے ساتھ
مسکرائی ہے سانولی صورت
الفتوں کے جمال کی مورت
مستیوں کے ہجوم ناچ اٹھے
زندگی کے شراب خانے میں
ایک جادو ہے مسکرانے میں

مختصر رامائن

(۱)

اُجلا اُجلا رام کا بچپن — جیسے جھلمل کرتا کنچن
سادہ بھتی بچپن کی بانی — آئی دلکش شوخ جوانی
رام کے نینوں میں لہرائی — بھری جوانی کی انگڑائی
جنک نے ایسا رچا سوئمبر — دُور دُور سے خلقت آئی
جو شنکر کا دھنش اُٹھائے — اُس کی ہو عزّت افزائی
سب ہارے جب زور لگا کر — سب نے جس دم مُنہ کی کھائی
رام نے بڑھ کر دھنش اُٹھایا — سب نے رام کی مہماں گائی

پھُولوں کی اِک سُندر مالا
رام کو سیتا نے پہنائی

(۲)

وقت نے ایسی لی انگڑائی — قسمت نے وہ گھڑی دکھائی

بن باسی کا پہن کے بانا — چلے اجودھیا سے رگھورائی

فرقت کے احساس نے سب کے — دل پر ایسی چوٹ لگائی

بیٹھے ارمانوں کی دُنیا — درد بنی، پلکوں پر آئی

چاند ستارے بھی شرمائے — اشکوں نے وہ جھلمل لائی

تاج و تخت تھے جس کا حصّہ — اس کے حصّے غربت آئی

بھگتوں کے لب کانپ اُٹھے جب
رام کہانی سُنی سنائی

(۳)

جنگل میں منگل کی باتیں — دن نُورانی اُجلی راتیں

پنچھی چہچہے۔ دلکش موسم — دُور ہُوا بے کیفی کا غم

رام نے بن میں کیا ٹھکانہ — ہونی کا ہے عجب فسانہ

راون چھل کا بھیس بنا کر — سیتا کو لے گیا اُڑا کر

بنا وہ یوگی رام سا یوگی — پھر بھی آخر رام تھا یوگی

بانر اپنے پاس بُلائے　لڑنے کے انداز سکھائے
بالی پر خود تیر چلایا　اور سگریو کو راج دلایا
ہر بانر نے لڑی لڑائی
اور سونے کی لنکا ڈھائی

(۴)

رام اور لچھمن آ گئے آگے　بانر سینا پیچھے پیچھے
لنکا پر کی گھور چڑھائی　ہر بانر نے دھوم مچائی
اِس کو مارا اُس کو مارا　دُشمن کو سب نے للکارا
لچھمن کو وہ زخم بھی آیا　ہنومان اِک بُوٹی لایا
نام تھا جس کا جیون بُوٹی　کڑی فسانے کی یوں ٹوٹی
میگھ ناتھ کی لاش پڑی تھی　کنبھ کرن کو موت لڑی تھی
رام نے راون مار گرایا　کھوئی سیتا کو پھر پایا
لنک پُری کی دھول اُڑائی
بانوں سے اگنی برسائی

رام نے کہا

بڑھے چلو بہادرو یہ زندگی کا گیت ہے

بلند وہ علم کرو کہ سر پہ سر قلم کرو — چلے وہ تیغِ حریت فسادیوں کا ناش ہو
یہ دھرم کا پیام ہے کہ ظلم پاش پاش ہو — جفاگروں کے دوش پر جفاگری کی لاش ہو

بڑھے چلو بہادرو یہ زندگی کا گیت ہے
قدم اگر ہوں بے خطر تو ہر قدم پہ جیت ہے
یہ جنگ شاندار ہے یہ وقت کی پکار ہے

یہ مقصدِ جمیل ہے وہ اہلِ تاج ختم ہو — جو بیکسوں پہ غرّہ ہے وہ بد مزاج ختم ہو
جو دشمنِ عوام ہے وہ سامراج ختم ہو — پیے جو خون آدمی کا وہ سماج ختم ہو

اٹھو اٹھو بڑھو بڑھو یہ زندگی کا گیت ہے
قدم اگر ہوں بے خطر تو ہر قدم پہ جیت ہے

اڑا دو دھول لنک کی ہو ختم دورِ کشتی — چھلی ہے جس نے جانکی مٹے وہ پُر غرور سر
چلاؤ اگن بان وہ کہ بھسم ہو عدو کا گھر — لگاؤ آگ لنک کو کہ جل بجھیں وہ بام و در
جو راونِ جفا نظر کے قصر کے چراغ ہیں — وہ سارے چُور چُور ہوں جو ظلم کے ایاغ ہیں

بڑھے چلو بہادرو یہ زندگی کا گیت ہے
قدم اگر ہوں بے خطر تو ہر قدم پہ جیت ہے

ستم کی ہے سزا ستم جو حد سے ہو سوا ستم — ستم اگر ہو برمحل کرم کو ہے روا ستم
ستمگروں نے ہم پہ وہ کیا ہے برملا ستم — ستم کی انتہا ہے یہ کہ خود بھی چیخ اُٹھا ستم
ستم نے کی یہ التجا کہ مجھ پہ یہ کرم کرو — یہی مری نجات ہے کہ میرا سر قلم کرو

بڑھے چلو بہادرو یہ زندگی کا گیت ہے
قدم اگر ہوں بے خطر تو ہر قدم پہ جیت ہے

گوکل کا وُہ گوالا

پھر یاد آ رہا ہے گوکل کا وہ گوالا
قدرت نے کی حفاظت غربت نے جس کو پالا
دانائے رازِ فطرت یعنی دلوں کا عالم
جس نے مٹا دیئے تھے سب کنس کے مظالم

پھر یاد آ رہا ہے وہ پیکرِ لطافت
وہ محرمِ حقیقت وہ نَے نوازِ فطرت
جس کے بکھیر دی تھی نغمات سے مسرّت
چہروں پہ آ گئی تھی ہر بات سے مسرّت

انوار بھر دیئے تھے تاریک زندگی میں
بدلا تھا بے رُخی کو دنیائے دوستی میں
اور عام ہو گئی تھی ہر بزم میں رفاقت
نظروں پہ چھا گیا تھا صدعالمِ صداقت

پھر یاد آرہا ہے وہ محرمِ سیاست
وہ غمِ ربائے دوراں وہ نَے نوازِ فطرت
پیشِ نظر تھی جس کے آسائشِ زمانہ
گایا تھا جس کے لب نے امرت بھرا ترانہ

امن و سکوں کی خاطر چھیڑی تھی جنگ جس نے
بخشا تھا کمتری کو غیرت کا ڈھنگ جس نے
ہر ظلم بن گیا تھا انصاف کا نشانہ
دلچسپ دل نشیں ہے جس شوخ کا فسانہ

پھر یاد آ رہا ہے وہ ماہِ کیف و مستی
"گیتا" میں جس نے کھولا ہر ایک رازِ ہستی
ارجن کی آتما کو جس نے جگا دیا تھا
لفظوں میں جس نے بھر کر لطفِ بقا دیا تھا

عظمت جہاں میں جس کی تسلیم ہو چکی ہے
دُنیا میں عام جس کی تعلیم ہو چکی ہے
کانوں میں گونجتے ہیں جس کے حسین ترانے
معمور از حقیقت ہیں جس کے سب فسانے

پھر یاد آ رہا ہے وہ نَے نوازِ فطرت
وہ پیکرِ شجاعت وہ زینتِ محبّت

بھگوان کرشن کب مُسکرائے

چار جانب تھے درو دیوارِ زندانِ مہیب
تیرگی سے بے ضیا و نور تھی چشمِ نصیب

نغمگی چُپ تھی فضا کے بربطِ خاموش میں
ایک بچّہ غمزدہ ماں باپ کے آغوش میں

جھوم کر یوں مسکرایا کنس کے انجام پر
قہقہوں کی بارشیں کیں گردشِ ایام پر

کرشن جب زندان سے گوکل کو جب جانے لگے
فرطِ اُلفت سے گوالے اشک برسانے لگے

کرشن نے اس وقت ان سے مسکرا کر یوں کہا
مدھ بھری ہنستی ہوئی نظریں ملا کر یوں کہا

کھیل ہے عہدِ محبت میں جُدائی اور وصال
اہلِ باطن کے لئے کیسی خوشی کیسا ملال
کنس کو جب موت کا ساغر پلایا وقت نے
ظلم کو انصاف کا منظر دکھایا وقت نے
مسکرائے کرشن فرمایا مآلِ جور دیکھ
ایک پاپی کی یہ حالت دیکھ چشمِ غور دیکھ
بر سرِ محفل ششو دُشنام برساتا رہا
کرشن اس کی اس جہالت پر بھی مسکاتا رہا
جب یہ دیکھا بڑھ گیا ہے حد سے اب دُشنام گو
دی ذرا ہلکی سی جنبش پھر سدرشن چکّر کو
تن سے اس کا سر ہُوا اک آن میں ایسے جُدا
جیسے دونوں میں کبھی کوئی تعلّق ہی نہ تھا
پانڈوؤں کے ایلچی بن کر چلے گوپال جب
دروپدی کے بکھرے بالوں نے کہا احوال سب

کرشن کے پیشِ نظر آئی دشاسن کی قضا
مسکرا کر کرشن نے پھر دروپدی سے یوں کہا

اب قریب خاتمہ ہے کوروؤں کا جور دیکھ
انتقامی دور کا منظر بچشمِ غور دیکھ

کار گاہِ جنگ میں ارجن ہوا جب سرنگوں
چھا گیا دل پر عزیزوں کی محبت کا فسوں

کرشن نے پھر مسکرا کر یوں کہا اے کم نظر
موت کے منہ میں ہیں سارے دیکھ آنکھیں کھول کر

جسم مرتا ہے بشر کا آتما مرتا نہیں
جس کو یہ عرفان ہے وہ موت سے ڈرتا نہیں

ادبیات

مزہ ہے بحرِ حوادث میں یوں بھی جینے کا
کہ موج موج تعاقب کرے سفینے کا

جنوں کے پاس وہ عرفان کا خزینہ ہے
خرد کے پاس نہیں راز جس خزینے کا

نظر اسیر، تخیل اسیر، شوق اسیر
یہ زندگی ہے تو کیا فائدہ ہے جینے کا

مرے نصیب میں لکھا ہے ڈوبنا شاید
پھرا ہے جانبِ طوفاں جو رُخ سفینے کا

(۲)

نہ اپنی عظمتِ رفتہ پہ لوگ ناز کریں
فروغِ وقت کو ماضی سے بے نیاز کریں

نظر میں حسنِ طلب ہو تو مل بھی سکتے ہیں
وہ آدمی کہ فرشتے بھی جن پہ ناز کریں

وہ بے نیاز نظر بھی نہ بے نیاز رہے
کچھ ایسی شان سے اک سجدۂ نیاز کریں

غرورِ حسن ہو رنگِ نیاز میں تحلیل
اس اہتمام سے تخلیقِ سوز و ساز کریں
درازیٔ شبِ ہجراں کو بھول جائیں ہم
وہ اپنی کاکلِ پیچاں اگر دراز کریں

(۳)

وہ داغ بھی ہوئے ہیں فروزاں کبھی کبھی
جن سے مٹی ہے ظلمتِ دوراں کبھی کبھی
پاکر ہجومِ یاس میں امید کی جھلک
آنسو ٹھہر گئے سرِ مژگاں کبھی کبھی
ہر شے میں عکس ریز ہوا ہے جمالِ دوست
لایا ہے رنگ شوقِ فراواں کبھی کبھی
سرمستیٔ جنوں کی حکایت سی بن گئے
آلامِ روزگار کے عنواں کبھی کبھی
آیا ہے جامِ عیش و مسرت بھی دور میں
کام آگئی ہے گردشِ دوراں کبھی کبھی

ویرانیوں میں لاکھ بہاریں مچل گئیں
یوں بھی ہوا ہے کوئی غزل خواں کبھی کبھی

مجبورِ التفات ہوئے ہیں وہ گاہ گاہ
ترکِ وفا پہ ہو گئے پشیماں کبھی کبھی

(۴)

لایا ہے رنگ عشق میں غم کا فسانہ کیا
اُن سے ہوئی ہے رسم و رہِ غائبانہ کیا

ہر آرزو نشاط سے محروم ہو گئی
ڈھائے گا ہم پہ اور ستم اب زمانہ کیا

دل ترکِ شوق کر نہ سکا باوجودِ غم
کیا جانے کہہ گئی وہ نظر غائبانہ کیا

ہنستے ہیں میرے چاکِ گریباں کو دیکھ کر
ناآشنائے درد ہیں اہلِ زمانہ کیا

اے کیفؔ ناگوار ہے ہر شئے بغیر دوست
کیا عشرتِ دوام غمِ جاودانہ کیا

(۵)

ذرّہ ذرّہ کہکشاں بر دوش ہے
حسنِ کامل زینتِ آغوش ہے

شاہدِ نازک ادا نازک سخن
پھر خریدارِ متاعِ ہوش ہے

اِذن دے کر پھر شکستِ ہوش کا
پوچھئے کیوں بیخود و مدہوش ہے

ناز کر اے نازبردارِ جنوں
حسن خود دابِ شوق در آغوش ہے

اے تغافل آشنا تیرا جمال
تیری نظروں سے ابھی روپوش ہے

(۶)

عشرتِ زیست کی گرانی سے
غم کی ارزانیوں کا دور نہ پوچھ

وہ نظر بھی نہ کر سکی آباد
دل کی ویرانیوں کا دور نہ پوچھ

اُن کے جلوے ہیں یا قیامت ہے
میری حیرانیوں کا دور نہ پوچھ

حسن جب عشق سے گریزاں تھا
وہ پریشانیوں کا دور نہ پوچھ

دردِ ہجراں کی داستاں مت چھیڑ
اشک افشانیوں کا دور نہ پوچھ

(۷)

میری مجبوریوں پر غور نہ کر | اپنی زلفیں سنوار اور سنوار
تیری مستی بھری نگاہوں سے | رنگ لیتے ہیں جلوہ ہائے بہار
تُو نے دیکھا کچھ ایسی نظروں سے | آرزوؤں پہ آ گیا ہے نکھار
تیری تعظیم بندگی تسلیم | وجہِ تسکیں ہے پھر بھی مے کا خمار

اپنی زلفوں کو اور کھلنے دے
تیری زلفیں ہیں وقت کے اسرار

(۸)

جہانِ عشق میں اک انقلاب لاؤں گا
کہیں سے ڈھونڈ کے تیرا جواب لاؤں گا
فضائیں جن کے ترنّم سے گیت بن جائیں
مرے ندیم وہ چنگ و رباب لاؤں گا
نئی سحر کے طلوعِ جمیل کی خاطر
نیا سپہر نیا آفتاب لاؤں گا
جہانِ شوق کی ویرانیاں سجانے کو
تری حسین جوانی کے خواب لاؤں گا

وہ حسن جس کی تجلّی کو ڈھونڈتی ہے نظر
میں اس جہاں میں اُسے بے نقاب لاؤں گا
بہار آئی ہے اے کیفؔ میکدے سے ابھی
برائے محفلِ رنداں شراب لاؤں گا

(۹)

گُل کی بہار، چاند کا جوبن، سحر کا نُور
جلوے ہیں میرے دامنِ ذوقِ نگاہ میں
اُٹھتے نہیں قدم جہاں منزل پرست کے
آتے ہیں وہ مقام بھی منزل کی راہ میں
کیفِ شراب کو بھی ذرا نیند آگئی
وہ مستئ و خمار ہے تیری نگاہ میں
رحمت کے اعتبار پہ جب بھی کیا گُناہ
لذّت ملی ثواب کی مجھ کو گُناہ میں
گُم ہو کے رہ گیا مری نظروں کا اضطراب
اے جانِ آرزو ترے کیفِ نگاہ میں

رہبر کی سادگی بھی عجب رہزنی تھی کیف
راہی تمام لُٹ گئے منزل کی راہ میں

(۱۰)

کس قدر احساس ہے فطرت کو میرے درد کا
جاگتے رہتے ہیں تارے رات بھر میرے لئے

میں وہ منزل ہوں کہ روزِ ابتدا سے آج تک
منزلیں لاکھوں ہیں سرگرم سفر میرے لئے

چند آنسو، چند آہیں، چند دل کی دھڑکنیں
داستانِ زندگی ہے مختصر میرے لئے

اے دلِ ناداں تلاشِ گوہرِ مقصود کر
غم کے بحرِ بیکراں میں ڈوب کر میرے لئے

شاہد و ساز و مغنی رقص و رم باکیف و کم
یہ نہیں تو زندگی ہے دردِ سر میرے لئے

(۱۱)

عشق آسان ہے نہ مرگ آساں   زندگی ہے کہ دردِ بے درماں

شوق افسردہ، آرزو ویراں — جانے وہ حاصلِ نظر ہے کہاں
اے جفائے نگاہِ دوست نہ توڑ — تازہ تازہ ہے وصل کا پیماں
بادِ ہجراں کے تند جھونکوں سے — جاگ اُٹھے ہیں درد کے طوفاں

کیفیت ہے شراب میں لیکن
بیخودیٔ نگاہِ دوست کہاں

(۱۲)

روزِ ازل سے داغ ہمارے لیے ہوئے
گردش میں آسماں ہے ستارے لیے ہوئے
بزمِ جنوں میں پھر کوئی سرگرمِ ناز ہے
آنکھوں میں جنّتوں کے نظارے لیے ہوئے
اہلِ وفا ہیں راہِ محبّت میں گامزن
یاس و امید و غم کے سہارے لیے ہوئے
پھر شوق ہے کہ آئے قیامت جہان میں
دامن میں اُس نظر کے اشارے لیے ہوئے

(۱۳)

مری نظر میں بہر رنگ ہیں ترے جلوے
میانِ دیر و حرم مجھ کو امتیاز کہاں
مجاز عین حقیقت سہی مگر اے دوست
جہاں ہو رنگِ حقیقت وہاں مجاز کہاں
میں ایک پیکرِ مستی میں ایک عالمِ کیف
میں بے نیاز کہاں حسرتِ نیاز کہاں

۱۴

یا گردشِ دوراں بدلے گی یا دل کا فسانہ بدلے گا
یہ اپنا یقینِ کامل ہے رفتارِ زمانہ بدلے گا
بے کیف زمانہ جائے گا، پُر کیف زمانہ آئے گا
قسمت کے عنواں کہتے ہیں قسمت کا فسانہ بدلے گا
یہ تلخ سیاست بدلے گی آزادی کی شیرینی میں
یہ سازِ غلامی بدلے گا اور اس کا ترانہ بدلے گا
زنجیرِ غلامی ٹوٹے گی اغیار کی قسمت پھوٹے گی
آثارِ زمانہ کہتے ہیں یہ رنگِ زمانہ بدلے گا

(۱۵)

ترے انوار سے نظروں کو بہلاتے رہے ہیں ہم
کبھی پھولوں کبھی تاروں کو شرماتے رہے ہیں ہم
تصوّر کی حدوں میں جب تجھے لاتے رہے ہیں ہم
سراپا حُسن کی تصویر بن جاتے رہے ہیں ہم
زہے تاثیرِ بیتابی، پریشانی و بیخوابی
کہ اپنے بھولنے والے کو یاد آتے رہے ہیں ہم
محبت، بے بسی، اُمید، حسرت، یاس، ناکامی
بہر عنواں فریبِ زندگی کھاتے رہے ہیں ہم
محبت میں اک ایسا عالم مستی بھی گذرا ہے
کہ جیسے اپنی ہستی سے گذر جاتے رہے ہیں ہم

(۱۶)

ہے محرم رازِ دل مُغنّی سنا رہا ہے عجب ترانہ
بدل گیا ہے بدل رہا ہے بدل ہی جائے گا یہ زمانہ

خزاں بہارِ چمن کی آمد کا راز بن کر چمن میں آئی
سمجھ سکے گا یہ راز وہ دل نگاہ جس کی ہے محرمانہ

یہ عہدِ حاضر کی برکتیں ہیں عداوتیں ہیں شقاوتیں ہیں
طریقِ انساں ہے جابرانہ روش ہے عالم کی قاہرانہ

ضمیرِ فطرت کا دب گیا ہے گناہ کے بوجھ سے یہاں تک
کہ دم بخود ہے سکونِ ہستی سسک رہا ہے دلِ زمانہ

فضیلتِ اہلِ فضل یہ ہے کہ آدمی میں ہو آدمیت
جو بزمِ عالم کو راس آئے ہو جزوِ لب وہ حسیں ترانہ

(۱۷)

دوام عکس ہے جس کا وہ حسنِ ذات ہوں میں
جو ماورائے تغیّر ہے وہ حیات ہوں میں

جمال و شوق ہیں کڑیاں مرے فسانے کی
تمام رنگ ہیں جس میں وہ کائنات ہوں میں

(۱۸)

میں اُس جگہ ہوں جہاں بے نقاب ہیں جلوے
سوالِ ذوقِ نظر کا جواب ہیں جلوے
یہ کائنات ہے حُسن کا ہے مے خانہ
کہ ماہ و مہر ہیں ساغر، شراب ہیں جلوے

(۱۹)

دلفریبی، دلکشی، رعنائی، رنگینی، جمال
سلسلہ در سلسلہ دل ہے گرفتارِ خیال
اس نتیجے پر میں پہنچا ہوں بفیضِ آگہی
بعدِ عشرت سعئ عشرت کا نتیجہ ہے ملال

(۲۰)

دیکھتی ہے حال کے ہر ایک منظر کو بشوق
اور بیاں کرتی ہے ماضی کا بھی افسانہ نظر
تیرے جلووں کے کھلونوں سے بھی کھیلی بارہا
میری طفلانہ تمنا، میری طفلانہ نظر

انانیت

چمن فروز نظاروں کو مسکرانے دے
بلند بام ستاروں کو جگمگانے دے

چمک رہا ہوں میں اپنی ہی آب و تاب کے ساتھ
کہ آفتاب کے جلوے ہیں آفتاب کے ساتھ

غم و الم سے زمانے کو نسبتیں ہوں گی
فغاں نصیب زمانے کی قسمتیں ہوں گی

خیالِ مرگ ہے مجھ کو نہ فکر جینے کی
فریبِ ہوش ہے عادت شراب پینے کی

بقا بدست ہوں خود بین و خود نواز ہوں میں
ہر ایک راز ہے جس میں نہاں وہ راز ہوں میں

کاروانِ شباب

بے سکوں ظلمتیں غروب ہوئیں
اک نئی روشنی طلوع ہوئی
مُسکرایا شباب ساقی کا
جام سے چاندنی طلوع ہوئی
ہر فضائے دیارِ پژمُردہ
بول ہنسی، تازگی طلوع ہوئی
حسنِ فطرت کی سادہ کاری سے
ہر طرف سادگی طلوع ہوئی
رنگ گھُلنے لگا ہواؤں میں
رنگ سے دلکشی طلوع ہوئی
نکہتوں کے خرامِ نازک سے
مستئ بےخودی طلوع ہوئی

دیکھ یہ وقت کی حسیں کروٹ
موت سے زندگی طلوع ہوئی

نرم و نازک سے آبگینوں سے
مے، چھلکتی ہوئی جوانی ہے
آمدِ صُبح، گُل سے شرمندہ
صُبحِ ویراں کی ہر کہانی ہے

زندگی نے لباس بدلا ہے
وقت نے رنگِ یاس بدلا ہے
دل اُمنگوں سے کامگار ہوا
آنکھ جلووں سے ہمکنار ہوئی
سازِ دل کی اُداس خاموشی
نغمگی بن کے آشکار ہوئی

رس بھرا گیت بن گئی دُنیا
ایک سنگیت بن گئی دُنیا

کاروانِ شباب آیا ہے
دشت مہکے ہیں پھول نکھرے ہیں
کس نے جھٹکا ہے ناز سے دامن
ماہ و انجم زمیں پہ بکھرے ہیں
ذرّہ ذرّہ ہے لُطف در آغوش
خُلد آباد بن گئی نظریں
شوخ رو داد بن گئی نظریں
رنگ و بُو کا سحاب چھایا ہے
کاروانِ شباب آیا ہے
حُسنِ دل کش سے ہو گئی آباد
اُجڑے اُجڑے سے پیار کی نگری
مست بھنوروں کے راگ سے چمکی
آگ بن کر بہار کی نگری
لالہ و گل کی انجمن یوں ہے
جیسے برق و شرار کی نگری

نیا سفینہ نیا کنارا

دیوالی کے سُندر دیپک
یُگ یُگ ہو تیرا اُجیارا
تیری جوت میں رام کے درشن
مُرلی والے شام کے درشن

آدِ جُگادِ سے جلنے والے
یُگ یُگ ہو تیرا اُجیارا
تیری جوتی ہے رُوحانی
جگمگ کرتے وید کی بانی
اندھیاروں میں کر اُجیارا
تیرا اُجیارا لافانی

بھارت کے اُجیارے دیپک
یُگ یُگ ہو تیرا اُجیارا
ایسے چمکے تیری جوتی
ہنس دے دیش کی قسمت سوتی
دُور غُلامی کی ظُلمت ہو
چمک اُٹھیں آشا کے موتی

دیوالی کے سُندر دیپک
یُگ یُگ ہو تیرا اُجیارا
اس اُجیارے میں ہم دیکھیں
جیون کی وہ امرت دھارا
جس کے ہر قطرے سے نکلے
نیا سفینہ نیا کنارا

تضاد

ویرانیوں کا زور تھا نغمات کی جگہ
بے کیفیاں تھیں لطف و عنایات کی جگہ
آغوشِ خواب میں تھیں اُمنگیں شباب کی
افسردگی تھی بزمِ خرابات کی جگہ

آئی بہار محفلِ ویراں بدل گئی
گُل کی ہنسی میں ظلمتِ امکاں بدل گئی
کھولی چمن میں آنکھ یہ کس جانِ ناز نے
دُنیا بہ حُسنِ صبحِ بہاراں بدل گئی

اُجڑیں گے رنگ پوش جوانی کے سب دیار
مُنہ پھیر لیں گے وقت پہ ایام زر نگار
رُخصت بھری نگاہ سے دیکھے گی باغ کو
پھولوں کی جانِ تازہ شگوفوں کی یہ ازدار

امیر دوست

امیر دوست تجھے کیا خبر غریبی کی
کہ شکل دیکھی نہیں تو نے بدنصیبی کی

ہجوم یاس میں اک آس مسکرائی تھی
مری غریبی ترے پاس مجھ کو لائی تھی

نہ پوچھا اتنا بھی تو نے کہ مدعا کیا ہے
مرے خموش لبوں کی یہ جو صدا کیا ہے

میں نامراد ترے در پہ جا کے لوٹ آیا
جگر پہ ایک نئی چوٹ کھا کے لوٹ آیا

ترے تغافلِ رنگیں کا کیا گلا مجھ کو
مرے نصیب میں لکھا تھا غم ملا مجھ کو

منتخب اشعار

وہ داغ بھی ہوئے ہیں فروزاں کبھی کبھی
جن سے مٹی ہے ظلمتِ دوراں کبھی کبھی

جہاں پرواز کرنے سے پرِ جبریل جلتے ہیں
خبردار اے جنوں شاید وہی مشکل مقام آیا

مجھے محرومیوں سے پیار ہے اے ذوقِ محرومی
مری آہوں کا سرمایہ ہے دردِ ناتمام اس کا

لکھی ہے میں نے چاندنی راتوں کے عکس پر
وہ داستانِ حسن جوانی کہیں جسے

وہ بجلیاں قابلِ پرستش جو آشیانے کو خاک کر دیں
کہ ذوقِ پرواز کا مخالف قفس سے بڑھ کر ہے آشیانہ

رزم پرست دیکھ کر تیغ بدست دیکھ کر
عقلِ سلیم نے کہا ہوش میں آدمی نہیں

شہیدِ حُسن کی خاکِ پریشاں سے کوئی پوچھے
شہیدِ حُسن ہو کر بھی پریشانی نہیں جاتی

شفق ہے خون مرے دل کی آرزوؤں کا
فلک نے چھین لی سُرخی مرے فسانے کی

کسی کی مست نگاہی کا آسرا لے کر
مزاجِ گردشِ دوراں بدل دیا میں نے

بعد مُدت کے ملے اور بے نیازانہ ملے
یوں ملے وہ جیسے بیگانے سے بیگانہ ملے

ہم لوگ جب سے اے غمِ دوراں بدل گئے
رودادِ حُسن و عشق کے عنواں بدل گئے

نگاہِ شوق میں جلوے سمائے جاتے ہیں
چراغِ دیر و حرم جھلملائے جاتے ہیں

ملتی نہیں ہے عشق میں مانگے سے موت بھی
اور زندگی ملی ہے تمنا کئے بغیر

پاکر ہجومِ یاس میں اُمّید کی جھلک
آنسو ٹھہر گئے سرِ مژگاں کبھی کبھی

غریب جان کے ٹھکرا دیا امیری نے
مرے خلوص کو، اُلفت کو، دلنوازی کو

بنائی جاتی ہے دُنیا مٹائی جاتی ہے
ہنسی وجود و عدم کی اڑائی جاتی ہے

مجھے زندگی کا الم ہو کیا مجھے موت کا بھی الم نہیں
میں ہوں اُس مقام بلند پہ کہ جہاں وجود و عدم نہیں

اُن کی مدہوش جوانی کے تصور کی قسم
ہوش کس چیز کو کہتے ہیں مجھے ہوش نہیں

حیرتوں میں ڈوبتی جاتی ہے ساری کائنات
آپ کے جلووں نے بخشی ہے وہ حیرانی مجھے

خرد کے نور سے بدلیں جہاں کی تقدیریں
خودی کے زور سے یزداں بدل دیا میں نے

جلوہ فروش کون تھا میری نگاہ میں
میری طرف جو شمس و قمر دیکھتے رہے

نہ جانے خلا کے سمندر میں کب سے
ستاروں کے روشن سفینے رواں ہیں

آگ میں یہ کود سکتا ہے خدا کے نام پر
اور خدا کی ذات سے انکار کر سکتا ہے عشق

اُٹھا کر پردہ ہستی حریم ذات میں ہم نے
جب اپنے حسن کو دیکھا نظر شرما گئی اپنی

اے ہمنشیں نہ ذکرِ تجلی بھی کر یہاں
بیہوش ہو نہ جاؤں نظارا کئے بغیر

مرنے لگے تو زندگی ارمان بن گئی
جیتے رہے تو موت کا ارماں نہ کر سکے

ترا جمال بھی آغوشِ انقلاب میں ہے
کبھی نقاب سے باہر کبھی نقاب میں ہے

محرمِ رازِ بقا ہوں مری نظروں میں فقط
زیست اک کھیل ہے اور مرگ فسانہ اے دوست

نقوشِ ہستی چمک اُٹھے ہیں تری نگاہوں کا عکس پاکر
بدل گئی روشنی میں جیسے تمام تر ظلمتِ زمانہ

راہِ ہستی میں اکیلا ہی نہیں میں گامزن
موت بھی تو ہمسفر ہے زندگی کے ساتھ ساتھ

فقیری کو شہنشاہی پہ حاصل برتری یہ ہے
یہ سُلطانی نہیں رہتی وہ سلطانی نہیں جاتی

محبّت میں اک ایسا عالمِ مستی بھی گذرا ہے
کہ جیسے اپنی ہستی سے گذر جاتے رہے ہیں ہم

تسکینِ دل کے واسطے ہر شے ہے بیقرار
تسکینِ دل کے واسطے سارے سفر میں ہیں

جینا اُسی کا قابلِ تحسین و داد ہے
جو موت کو حیات کی منزل بنا سکے

کس قدر احساس ہے فطرت کو میرے درد کا
جاگتے رہتے ہیں تارے رات بھر میرے لئے

دریا کی موج موج روانی پسند ہے
دریا کے ساتھ ساتھ کنارے سفر میں ہیں

چند آنسو چند آہیں چند دل کی دھڑکنیں
عشق کی یہ دولتیں ہیں تیرے دیوانوں کے پاس

چاندنی راتوں کو شرماتا رہا تیرا خیال
لالہ و گل کو چمن میں نیند سی آئی رہی

مجھے اُن منزلوں پر لے چلی ہے ہستی عرفاں
جنوں جن منزلوں سے عقل کو آواز دیتا ہے

نرائن دت سہگل پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر [illegible] لوہاری دروازہ لاہور سے شائع کیا